Regd. L. No. 7243

Phone, 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اگست 1970

ہماری آزادی اور غلامی کا معیار

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت صرف خدا کی ہوتی ہے جس کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن مجید کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کیلئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے +

(قائد اعظم محمد علی جناح)

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک

پاکستان — سالانہ — دس روپے

ہندوستان — سالانہ — پندرہ روپے

غیر ممالک — سالانہ — ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ

پاکستان — ایک روپیہ

ہندوستان

ڈیڑھ روپیہ

ٹیلیفون

۸۰۸۰۰

خط وکتابت

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

۲۵ - بی. گلبرگ لاہور

جلد ۲۳ — اگست (۱۹۷۰ء) — نمبر ۸

فہرست

(۱) لمعات — ۲

(۲) جشنِ آزادی — ۱۹

(۳) اپنی بہنوں کے نام — ۲۳

(۴) مودودی صاحب کا انتقامی اسلام — (شاہد عادل) — ۳۷

(۵) اسلامی مملکت میں مذہبی پیشوائیت کی کوئی گنجائش نہیں — ۵۰

(۶) طلوعِ اسلام کالج فنڈ — (سیکرٹری قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی) — ۶۴

(۷) حقائق وعبر — ۶۷

(۸) باب المراسلات — ۷۱

(۹) علمائے کرام۔ امام غزالیؒ کی نگاہ میں (قسط سوم) — (رفیع اللہ) — ۷۳

(۱۰) مفہوم القرآن — ۷۹

[illegible] خلیل [illegible] ناشر [illegible] مقام اشاعت ۲۵/بی گلبرگ لاہور۔ پرنٹر شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ اشرف پریس۔ ایبک روڈ۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

۱۴ اگست کی یاد میں

وَذَكِّرْهُم بِأَيَّامِ اللَّهِ (۱۴/۵)
انہیں خدا کے دنوں کی یاد دلاؤ۔

تاریخ بتاتی ہے کہ حضورؐ نبی اکرم کے عہدِ سعید میں مدینے کے یہودی عاشورہ کے دن روزہ رکھا کرتے تھے۔ حضورؐ کے استفسار پر بتایا گیا کہ اس دن بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات حاصل ہوئی تھی اس لئے وہ اس تقریبِ مسرت کی یاد تازہ رکھنے کے لئے شکرانِ نعمت کے طور پر اس دن کا روزہ رکھتے ہیں۔ اس پر حضورِ رسالتمآبؐ نے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ وہ بھی اس تقریب میں یہودیوں کا ساتھ دیں اور عاشورہ کا روزہ رکھا کریں۔ کیونکہ کسی قوم کی غلامی سے نجات، اسی قوم کے لئے وجہِ مسرت نہیں بلکہ یہ پوری نوعِ انسانی کے لئے باعثِ شرف و سعادت ہے۔ حضورِ رسالتمآبؐ نے یہ واضح کر دیا کہ غلامی ایک ایسی لعنت ہے جو قوموں کو شرفِ انسانیت سے محروم کر دیتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اسی حقیقت کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا تھا کہ

غلامی کیا ہے ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہے وہی زیبا
بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا

۱۴ اگست کو ہماری حیاتِ ملی میں یومِ آزادی کی حیثیت حاصل ہے اور اس دن پاکستان کے

طول و عرض میں آزادی کا جشن مسرت بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ یہ جشن آزادی کچھ ہمیں سے مخصوص نہیں دنیا کی اکثر و بیشتر قومیں اپنے اپنے ہاں یوم آزادی کی تقریب اسی وفور مسرت سے مناتی ہیں۔ اس دن کی یاد میں انکے ہاں بھی فضا میں مسرت کے نغمے گونجتے ہیں۔ خوشی کے شادیانے بجتے ہیں۔ فضا جشن چراغاں سے بقعۂ نور بن جاتی ہے اور مسرت کے ان ہنگاموں میں چاروں طرف یہ احساس کارفرما ہوتا ہے کہ اس دن ان کی غلامی کی زنجیریں ٹوٹی تھیں۔ ان کی بے بسی اور محکومی کے بندھن کٹ گئے تھے۔ انہیں دوسروں کے استبداد سے نجات ملی تھی اور اب وہ اس قابل ہیں کہ اپنی مملکت کے دائرے میں اپنی مرضی کے مطابق آئین و قوانین رائج کر سکیں۔ اپنی منشار کے مطابق احکام کا نفاذ عمل میں لا سکیں۔ ان کی آزادی پر خارج سے کوئی پابندی عائد نہ ہو۔

یہاں یہ بڑا اہم اور بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہماری آزادی کا مفہوم اور منشار و مقصود بھی یہی تھا؟ یعنی ہم جو جشن آزادی کی تقریب مناتے ہیں تو کیا یہ بھی آزادی کے اسی تصور کی آئینہ دار ہے جو دیگر اقوام میں رائج ہے؟ پاکستان کو آزادی حاصل کئے تئیس برس ہو گئے۔ کہا جائے گا کہ اتنے سالوں کے بعد اس انوکھے سوال کو اٹھانے کی ضرورت کیا پڑی ہے؟ ہم نے کئی سال تک اپنی آزادی کی جنگ لڑی۔ اس جنگ میں کامیابی حاصل کی اور اپنی آزاد مملکت میں زندگی بسر کرتے اتنے سال گذر گئے۔ اب یہ سوال کہ "ہم نے پاکستان کیوں مانگا تھا؟" کیوں اٹھایا جائے۔

پیشتر اس کے کہ ہم اپنی آزادی کے منشار و مقصود کے اہم اور بنیادی سوال کی طرف آئیں ہم تمہیداً اس کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ بعض وجوہات کی بنا پر یہ سوال ہمارے ہاں بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ حصول پاکستان کے بعد اکثر و بیشتر ان عناصر نے بھی پاکستان میں ڈیرے ڈال دیئے جو تحریک پاکستان کے دوران اس کی مخالفت میں ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگاتے رہے تھے۔ انہوں نے پاکستان کو اپنی جائے پناہ بنا لیا اور یہاں اپنی کمین گاہوں میں بیٹھ کر اس قسم کا پروپیگنڈہ شروع کر دیا جو مایوسی اور ذہنی انتشار کا باعث ہو۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ہم نے کم و بیش دس برس تک حصول پاکستان کے لئے مسلسل جدوجہد کی۔ لیکن جب یہ حاصل ہو گیا تو ہم نے ایک دوسرے سے یہ پوچھنا شروع کر دیا کہ ہم نے پاکستان مانگا کیوں تھا؟ اس مطالبے سے ہمارا مقصد کیا تھا؟ اور ذہنی انتشار کی یہ کیفیت یہاں تک پہنچ گئی کہ چاروں طرف سے عجیب غریب آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ایک نے کہا۔ اے صاحب! پاکستان تو ہندو کی تنگ نظری کا نتیجہ ہے۔ اگر وہ کشادہ دلی سے کام لیتے تو پاکستان کے بننے اور نہ بننے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ گویا پاکستان کی بنیاد کسی مثبت جذبہ پر نہیں تھی۔ یہ محض ہندو کی تنگ نظری کا نتیجہ ہے۔ دوسری طرف سے آواز آئی کہ حضرت! یہ انگریز کی ایک چال تھی۔ وہ چاہتا یہی تھا کہ ہندوستان سے ایسی حالت میں رخصت ہو کہ ہندو اور مسلمان آپس میں ہمیشہ لڑتے رہیں۔ چنانچہ اس نے پاکستان

کا تصور پیدا کیا اور مسٹر جناح کو اس مقصد کے لئے آگے بڑھا دیا۔ گویا مسٹر جناح انگریز کے اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے آلۂ کار تھے۔ یہ اس شخص کے متعلق کہا جا رہا ہے جس کے متعلق اس کے بدترین دشمنوں کو بھی اس امر کا اعتراف تھا کہ وہ کسی قیمت پر کسی کے ہاتھ بک نہیں سکتا۔

یہ لوگ تو خیر تھے ہی تحریکِ پاکستان کے مخالفین۔ تحریکِ پاکستان کی کامیابی کو انہوں نے اپنے لئے ایک گہرے زخم کے طور پر قبول کیا اور اس کی کسک سے انہیں آج تک چین نصیب نہیں ہوا۔ اس لئے یہ حضرات جو کچھ کہتے اور کرتے ہیں وہ غیر متوقع نہیں۔ لیکن ہمیں انتہائی قلق (بلکہ صدمہ) اس بات کا ہے کہ ہمارے اکابرینِ ملت، جو تحریکِ پاکستان میں شامل تھے اور جن کے متعلق ذہنوں میں یہ تصور جاگزین ہے کہ وہ اس حقیقت سے باخبر تھے کہ مطالبۂ پاکستان کی بنیاد کیا تھی اور اسے کس مقصد کے لئے حاصل کیا گیا تھا، ان کی طرف سے بھی اسی قسم کی باتیں سننے میں آ رہی ہیں ——— ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے! ——— چونکہ ہماری نئی نسل یہ سمجھتی ہے (اور ایسا سمجھنے میں وہ بالکل حق بجانب ہے) کہ یہ بزرگانِ کرام جو کچھ کہتے ہیں وہ تو یقیناً مبنی بر حقیقت ہوگا۔ اس لئے ان حضرات کے ارشادات جس قسم کی غلط فہمیاں پیدا کرنے کا موجب ہو سکتے ہیں ان کا ازالہ نہایت ضروری ہے۔ اور یہی وہ احساس ہے جس کی بنا پر ہم نے، اس جشنِ آزادی کی تقریب پر اس بنیادی سوال کو ایک بار پھر سامنے لانے کی ضرورت سمجھی کہ ہمارے مطالبۂ پاکستان کی بنیاد کیا تھی اور اس مملکت کے حصول اور قیام سے مقصود کیا۔

یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کا تصور علامہ اقبالؒ کی بصیرتِ قرآنی کا رہینِ منت ہے۔ اس لئے ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ ان کے اس تصور کا محرک جذبہ کیا تھا۔

دین اور مذہب کا فرق

اس مقصد کے لئے سب سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اقبالؒ پاکستان میں اسلام کو "مذہب" کی حیثیت سے نہیں بلکہ "دین" کی حیثیت سے نافذ العمل دیکھنا چاہتے تھے۔ "مذہب" (جسے عام طور پر RELIGION کہہ کر پکارا جاتا ہے) خدا اور بندے کے درمیان ایک پرائیویٹ تعلق کا نام ہے جسے انسان کی تمدنی، عمرانی، سیاسی، معاشی زندگی سے کچھ واسطہ نہیں۔ اس پرائیویٹ تعلق کو ایک عیسائی اپنے گرجے میں، ایک پارسی اپنے آتشکدہ میں، ایک ہندو اپنے مندر میں اور (اسی خیال کے مطابق) ایک مسلمان اپنی مسجد میں — بلکہ یوں کہیئے کہ ہر شخص اپنے اپنے گھر کے کسی کونے میں یا پہاڑ کے کسی غار میں ——— اپنے طور پر قائم کر سکتا ہے۔ ایسا کرنے سے مذہب کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے اور اس کے بعد یہ لوگ اپنی عملی تمدنی زندگی میں اپنے اپنے ہاں کی سیاست کے مطابق کام کرتے رہیں۔ یہ تو ہے مذہب کا تصور۔ لیکن اس کے برعکس "دین" خدا اور بندے کے درمیان کسی پرائیویٹ تعلق کا نام نہیں بلکہ یہ زندگی کا ایک ضابطہ اور نظامِ حیات ہے جو انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔

اقبالؒ اور خطبہ الٰہ آباد

۱۹۳۰ء میں جب اقبالؒ نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس الٰہ آباد کے خطبۂ صدارت میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ مملکت کا مطالبہ پیش کیا تو اس میں فرمایا۔

ہندوستان دنیا بھر میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے کہ اسے ایک علاقے میں مرکوز کر دیا جائے ... حقیقت یہ ہے کہ اسلام خدا اور بندے کے درمیان ایک روحانی واسطہ کا نام نہیں، یہ ایک نظام حکومت ہے۔ اس نظام کا تعین اس وقت ہو چکا تھا جب کسی روسو کے دل میں ایسے نظام کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ اس نظام کی بنیاد ایک ایسے اخلاقی نصب العین پر رکھی گئی ہے جس کی رو سے انسان، جمادات اور نباتات کی طرح پابگِل مخلوق نہیں سمجھا جاتا کہ اس کو کبھی اس خطۂ زمین سے منسوب کر دیا اور کبھی اس سے۔ بلکہ وہ ایک ایسی بلند و بالا ہستی سمجھا جاتا ہے جس کی صحیح قدر و قیمت اس وقت معلوم ہوتی ہے، جب وہ ایک خاص معاشرتی نظام کی مشینری میں اپنی جگہ فٹ ہو۔ (اور یہ مقصد اپنی آزاد مملکت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا) اسی لئے میری آرزو یہ ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد اسلامی ریاست قائم کی جائے۔

نیشنلسٹ علماء کا تصورِ آزادی

ہمارے ہاں کے اُس وقت کے نیشنلسٹ علماء حق کے سرخیل مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) تھے۔ ان کے نزدیک اسلام اور مسلمانوں کی آزادی کا تصور وہ تھا جس کے بارے میں اقبالؒ نے کہا تھا کہ

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے مسلمان ہے آزاد

چنانچہ مولانا مدنی (مرحوم) کے ایک اخباری بیان کا جواب دیتے ہوئے علامہ اقبالؒ مرحوم نے کہا تھا کہ۔

مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریزی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے۔ لیکن آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں۔ بلکہ ہمارا اولین مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائے۔ اس لئے میں کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا جن کی بنیادیں انہیں اصولوں پر ہوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد؟ ہم تو

یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے۔ لیکن اگر آزادیٔ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بھی بدتر بن جائے تو مسلمان آزادیٔ وطن پر ہزار مرتبہ لعنت بھیجتا ہے۔ ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا، بولنا، روپیہ صرف کرنا، لاٹھیاں کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا سب کچھ حرام اور قطعی حرام سمجھتا ہوں۔

قائد اعظمؒ

علامہ اقبالؒ کے بعد قائد اعظمؒ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کے لئے جداگانہ مملکت کے قیام کی جدوجہد میں سالارِ کارواں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے سامنے پاکستان اور اس کے نظامِ مملکت کے بارے میں بعینہٖ وہی تصور تھا، جو علامہ اقبالؒ کے ذہن میں تھا! چنانچہ تحریک پاکستان کی جدوجہد میں وہ شروع سے آخر تک اس حقیقت کو دہراتے چلے گئے۔ مثلاً ۱۹۴۵ء میں فرنٹیر مسلم سٹوڈنٹس کے نام اپنے پیغام میں انہوں نے فرمایا۔

> پاکستان سے مطلب یہی نہیں کہ ہم غیر ملکی حکومت سے آزادی چاہتے ہیں۔ اس سے حقیقی مراد مسلم آئیڈیالوجی ہے جس کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ ہم نے صرف اپنی آزادی حاصل نہیں کرنی۔ ہم نے اس قابل بھی بننا ہے۔ کہ ہم اس کی حفاظت بھی کر سکیں اور اسلامی تصورات اور اصولات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔

۲۴ر نومبر ۱۹۴۵ء کو ایڈورڈس کالج پشاور میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے الگ الگ نظریۂ زندگی کی وضاحت فرمائی بلکہ دین اور مذہب کے فرق کو بھی نمایاں کر کے رکھ دیا۔ انہوں نے فرمایا۔

> ہم دونوں قوموں میں صرف مذہب کا فرق نہیں۔ ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین ہمیں ایک ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں ہماری راہنمائی کرتا ہے۔ ہم اس ضابطے کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے ۱۹۴۰ء کے تاریخی اجلاس لاہور میں، جہاں پاکستان کی قرارداد منظور ہوئی تھی، تقریر کرتے ہوئے قائد اعظمؒ نے کہا۔

> میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی، اسلام اور ہندومت کی حقیقت اور اہمیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کر رہے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ دونوں "مذہب" نہیں بلکہ ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی نظام ہیں۔ اور اس بنا پر متحدہ قومیت ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھئے ہندو اور مسلمان، مذہب کے

ہر معاملے میں جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے یہ
دو الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بنیادیں متضاد تصوّرات پر ہیں۔ دو ایسی
قوموں کو ایک نظامِ سلطنت میں یکجا کر دینا باہمی مناقشت کو بڑھائے گا اور بالآخر
اس نظام کو پاش پاش کر دے گا۔ جو اس ملک کی حکومت کے لئے وضع کیا جائے گا۔

ان تصریحات کے ساتھ لاہور کے تاریخی اجلاس میں قراردادِ پاکستان منظور ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے دس کروڑ مسلمانوں نے اسے اپنے ملّی نصب العین اور تقاضائے دین و ایمان کی حیثیت سے نہ صرف قبول کر لیا بلکہ اس کے لئے آخری خندق تک لڑ مرنے کے لئے کار زارِ سیاست میں نکل آئے۔

اس قرارداد کو قومی نصب العین کی صورت اختیار کئے ابھی ڈیڑھ سال نہیں گزرا تھا کہ اگست ۱۹۴۱ء میں قائدِ اعظمؒ حیدر آباد تشریف لے گئے اور وہاں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء نے ان سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کے دوران طلباء نے قائدِ اعظمؒ سے بڑے اہم اور بنیادی سوالات کئے جن کے جوابات قائدِ اعظمؒ نے ایسے متعین، دو ٹوک اور نکھرے ہوئے انداز میں دیئے کہ مملکتِ پاکستان کے حصول کا منشاء و مقصود پوری طرح واضح ہو کر سامنے آگیا۔ اور مینیٹ پریس کے نمائندے نے اس ملاقات کی جو رپورٹ مرتب کی اس کے ضروری حصے سوالات و جوابات کی صورت میں درج ذیل ہیں۔

سوال:- مذہب اور مذہبی حکومت کے لوازم کیا ہیں؟

جواب:- جب میں انگریزی زبان میں مذہب (RELIGION) کا لفظ سنتا ہوں تو اس زبان اور محاورے کے مطابق لامحالہ میرا ذہن، خدا اور بندے کے باہمی پرائیویٹ تعلق کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن میں خوب جانتا ہوں کہ اسلام اور مسلمانوں کے نزدیک مذہب کا یہ محدود اور مقید مفہوم اور تصور نہیں۔ میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملّا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعویٰ ہے۔ البتہ میں نے قرآن مجید اور قوانینِ اسلامیہ کے مطالعہ کی اپنے طور پر کوشش کی ہے۔ اس عظیم کتاب کی تعلیمات میں انسانی زندگی کے ہر باب کے متعلق ہدایات موجود ہیں۔ زندگی کا روحانی پہلو ہو یا معاشرتی۔ سیاسی ہو یا معاشی۔ غرضیکہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جو قرآنی تعلیمات کے احاطہ سے باہر ہو۔ قرآنِ کریم کی اصولی ہدایات اور ضابطۂ عمل نہ صرف مسلمانوں کے لئے بہترین ہیں، بلکہ اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے لئے حسنِ سلوک اور آئینی حقوق کا جو حصہ ہے اس سے بہتر کا تصور ناممکن ہے"۔

قرآنی مملکت

قائدِ اعظمؒ کا اپنے متعلق اعتراف و اعلان یہ تھا کہ "میں نہ کوئی مولوی ہوں نہ ملّا۔ نہ مجھے دینیات میں مہارت کا دعوےٰ ہے"۔ لیکن اسلامی نظام کی اصل و بنیاد کے متعلق جو کچھ انہوں نے سمجھا اور کہا ہے، ذرا غور کیجئے کہ دینیات میں مہارت کے کتنے مدعی ہیں جو اسلامی نظام کی اس گہرائی تک پہنچ پاتے ہیں؟

سِرِّ خدا کہ زاہد و عابد بکس نہ گفت
در حیرتم کہ دُرد کشاں از کجا شنید!

اشتراکیت

سوال:۔ اس سلسلے میں اشتراکی حکومت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب:۔ "اشتراکیت، بالشویت یا اسی قسم کے دیگر سیاسی اور معاشی مسالک، درحقیقت اسلام اور اس کے نظامِ سیاست کی غیر مکمل اور بھونڈی سی نقلیں ہیں۔ ان میں اسلامی نظام کے اجزار کا سا ربط اور تناسب نہیں پایا جاتا"

کتنی بڑی حقیقت ہے جسے چند الفاظ میں سمٹا کر رکھ دیا گیا ہے۔ روس کی کمیونزم ہو یا مغرب کی ڈیماکریسی، یہ سب اسلامی نظام کے مختلف اجزار کی بھونڈی سی نقلیں ہیں جب تک ان میں علامہ اقبال کے الفاظ میں "خدا" شامل نہ کر دیا جائے یہ نوعِ انسانی کے لئے کبھی ایسے منفعت بخش نتائج پیدا نہیں کر سکتے جو اسلامی نظام کا خاصہ ہیں۔

اب اس کے بعد وہ تیسرا سوال اور اس کا جواب ملاحظہ فرمایئے جو ہمارے نزدیک اس موضوع پر حرفِ آخر ہے۔ غور سے سنیئے۔

سوال:۔ اسلامی حکومت کے تصور کی امتیازی خصوصیت کیا ہے؟

جواب:۔ اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں، اسلامی حکومت، دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے"۔

صرف قرآن کی اطاعت

آپ اس جواب کے ایک ایک فقرہ پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ اس حقیقت کو کس قدر غیر مبہم، مختصر لیکن جامع الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ کوئی مملکت 'اسلامی' کس طرح بنتی ہے۔ اسلام کی بنیادی تعلیم لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ۔ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے سوا کوئی اور ہستی ایسی نہیں جس کی اطاعت اختیار کی جائے۔ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ، اس کے سوا کسی اور کا فیصلہ قابلِ قبول نہیں ہو سکتا، کسی اور کو اس کا حق ہی حاصل نہیں کہ کسی سے اپنا فیصلہ اور حکم منوائے۔

لیکن خدا تو ایک ان دیکھی، مطلق ذات کا نام ہے۔ اس کی اطاعت کی عملی شکل کیا ہوگی؟ کیسے معلوم کیا جائیگا کہ فلاں معاملہ میں اس کا حکم اور فیصلہ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ "اس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام

اور اصول ہیں"۔ اسی لئے اس کا ارشاد ہے کہ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَ لَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِیَآءَ۔ (۷/۳) جو کچھ تمہاری طرف خدا نے نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو۔ اس کے سوا کسی اور سرپرست کا اتباع مت کرو۔" بالفاظ دیگر" اسلامی حکومت قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے"۔ اسی کے احکام جاری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ یہی چیز کفر اور ایمان کا خطِ امتیاز قرار پاتی ہے۔ وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْکٰفِرُوْنَ۔ (۵/۴۴) جو خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتا۔ تو یہی لوگ ہیں جنہیں کافر کہا جاتا ہے۔

(۶)

قائداعظم کی اس دو ٹوک وضاحت سے مملکتِ پاکستان کا بنیادی دستور ابھر کر سامنے آجاتا ہے اور اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ ان کے نزدیک مملکتِ پاکستان کے آئین و قوانین کی اساس قرآن کریم کے سوا اور کوئی نہیں تھی۔ قرآن کریم کی عظمت اور جامعیت ان کے دل و دماغ پر کس حد تک اثر انداز تھی اس کا اندازہ ان کے اکثر بیانات سے سامنے آسکے گا۔ چنانچہ ۱۹۴۵ء میں عید کی تقریب سعید پر قوم کے نام اپنے پیغام میں انہوں نے فرمایا۔

قرآن کی جامعیت

اس حقیقت سے ہر مسلمان باخبر ہے کہ قرآن کے قوانین صرف مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں۔ گبن نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ "بحرِ اطلانٹک سے لے کر گنگا تک ہر جگہ قرآن کو ضابطہ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے جس کا تعلق صرف الٰہیات تک نہیں، بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جس کے قوانین نوعِ انسان کے تمام اعمال و احوال کو محیط ہیں اور وہ قوانین منشائے خداوندی کے مظہر ہیں"۔

اس حقیقت سے سوائے جہلا کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا ضابطہ اخلاق ہے، جو مذہب، معاشرت، تجارت، عدالت، فوج، سول اور فوجداری کے تمام قوانین کو اپنے اندر لئے ہوتے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کی زندگی کے عام معاملات، روح کی نجات کا سوال ہو یا بدن کی صفائی کا۔ اجتماعی واجبات کا مسئلہ ہو یا انفرادی حقوق کا۔ ان تمام معاملات کے لئے اس ضابطہ میں قوانین موجود ہیں۔ اسی لئے نبی اکرم نے فرمایا تھا کہ ہر مسلمان کو قرآن کا نسخہ اپنے پاس رکھنا چاہیئے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جانا چاہیئے۔

یہ تھی قرآن کریم کی عظمت اور جامعیت جس پر قائداعظم کا ایمان تھا۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ ہندوستان کے مسلمان مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان کی الگ پارٹیاں بھی تھیں۔ ان میں نسلی اور صوبائی تعصب بھی موجود تھا۔ خود پاکستان کو جن دو بڑے بڑے خطوں پر مشتمل ہونا تھا یعنی مغربی اور مشرقی پاکستان۔ ان میں ہزاروں میل کا فاصلہ تھا۔ لسانی اور نسلی نقطۂ نگاہ سے بھی ان دونوں خطوں کے رہنے والوں میں

مسلمانوں کی وجۂ جامعیت

کوئی وجہِ اشتراک نہ تھی۔ سوال یہ تھا کہ ان تمام وجوہِ اختلاف کے باوجود وہ کون سی قدرِ مشترک تھی جو ان باہمدگر متضاد عناصر کو ایک نقطہ پر جمع کر سکتی تھی؟ اس کا جواب قائداعظمؒ کے الفاظ میں سنیئے۔ انہوں نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس دسمبر ۱۹۴۳ء واقع کراچی میں پہلے خود ہی یہ سوال اٹھایا کہ

> وہ کون سا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں۔ وہ کون سی چٹان ہے جس پر ان کی ملت کی عمارت استوار ہے۔ وہ کون سا لنگر ہے جس سے اس امت کی کشتی محفوظ کر دی گئی ہے۔

اس کے بعد خود ہی اس سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا کہ

> وہ بندھن، وہ رشتہ، وہ چٹان، وہ لنگر، خدا کی کتاب عظیم، قرآنِ کریم ہے۔ مجھے یقینِ محکم ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے، ہم میں زیادہ سے زیادہ وحدت پیدا ہوتی جائے گی۔
>
> ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب، ایک امت۔

(۱)

حصولِ پاکستان کے بعد

مطالبۂ پاکستان کے منشاء و مقصود کی وضاحت کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے حصولِ پاکستان تک مختلف مواقع پر جو کچھ ارشاد فرمایا اس کے چند گوشے آپ کے سامنے آ گئے۔ اب حصولِ پاکستان کے بعد کا معاملہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ وہ لوگ جو حصولِ پاکستان کے مقاصد کو عوام کی نگاہوں سے اوجھل کرنے کے درپے ہیں، یہ کہتے سنائی دیں گے کہ حصولِ پاکستان سے قبل بے شک قائداعظمؒ نے یہی کچھ کہا تھا لیکن اس کے حصول کے بعد انہوں نے اپنے خیالات میں تبدیلی کر لی تھی۔ ہمارے نزدیک یہ نہ صرف قائداعظمؒ کی عظمتِ کردار پر گھناؤنا الزام ہے بلکہ واقعات و حقائق کے سراسر منافی بھی۔ حصولِ پاکستان کے بعد بھی قائداعظمؒ کے موقف میں ذرہ بھر تبدیلی نہیں آئی۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے انہوں نے کراچی کے خالق دینا ہال میں افسرانِ حکومت سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

> پاکستان کا قیام جس کے لئے ہم گزشتہ دس سال سے مسلسل کوشش کر رہے تھے، اب خدا کے فضل سے ایک حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آ چکا ہے۔ لیکن ہمارے لئے اس آزاد مملکت کا قیام مقصود بالذات نہیں تھا، بلکہ ایک عظیم مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہمیں ایک ایسی مملکت مل جائے جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں اور جس میں ہم اپنی روشنی اور ثقافت کے مطابق نشوونما پا سکیں اور جہاں اسلام کے عدلِ عمرانی کے اصول آزادانہ طور پر روبہ عمل لائے جا سکیں۔

پاکستان کا آئین

حصولِ پاکستان کے بعد سب سے اہم مسئلہ آئینِ مملکت کی ترتیب و تدوین کا تھا۔ اسلام کے نام پر ایک نئی مملکت نقشۂ عالم میں اپنا مقام پیدا کر چکی تھی اور ایک دنیا کی نگاہیں یہ دیکھنے کے لئے بے تاب تھیں کہ اس مملکت میں کس قسم کا آئین متشکل ہوتا ہے۔ مشرق و مغرب کے کروڑوں انسان گوش بر آواز تھے کہ اس سلسلے میں کارفرمایانِ مملکت کی طرف سے کوئی واضح اور دو ٹوک اعلان سن سکیں۔ خود قائداعظمؒ نے بھی اس کی ضرورت محسوس کی اور فروری ۱۹۴۸ء میں اہلِ امریکہ کے نام ایک پیغام براڈکاسٹ کرتے ہوئے فرمایا:۔

> پاکستان کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی نے ابھی پاکستان کا آئین مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس آئین کی آخری شکل کیسی ہو گی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ بردار جمہوری انداز کا آئین ہو گا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح ڈیڑھ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل اور دیانت کی تعلیم دی ہے۔ آئینِ پاکستان کے مرتب کرنے کے سلسلہ میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں، ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ لیکن کچھ بھی ہو، بہرحال یہ امر مسلمہ ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہو گی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعم خویش) "خدائی مشن" کو پورا کریں۔

تھیاکریسی نہیں ہو گی

مذہبی پیشوائیت کی طرف سے مخالفت کیوں؟

قائداعظمؒ کا یہ اعلان مذہبی پیشوائیت کے لئے پیامِ موت سے کم نہیں تھا۔ پاکستان کے قیام سے یہ حضرات اس خوش فہمی اور خود فریبی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ جب یہاں اسلامی نظام قائم ہو گا تو شرعی احکام و قوانین

اور فیصلوں کے لئے مختار مطلق بہرحال وہی قرار پائینگے۔ لیکن قائد اعظم نے دوٹوک الفاظ میں بتا دیا کہ قرآنی نظام کسی ایسے گروہ کی اجارہ داری تسلیم نہیں کرتا۔ یہیں سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہمارے مذہبی پیشوا تحریک پاکستان کی مخالفت میں کیوں اغیار کے آلۂ کار بن کر آگے بڑھے تھے اور ان کی مخالفت کا یہ سلسلہ دراز آج تک کیوں نئے نئے فتنے بکھیرتا چلا آرہا ہے۔ تیئیس سال سے یہاں اسلامی نظام کے نقاب میں جو کچھ کہا اور کیا جارہا ہے وہ اس کے سوا کیا ہے کہ یہاں وہ تھیا کریسی قائم ہو جس میں اقتدار اعلیٰ مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور جس میں انسانیت کا بُری طرح گلا گھٹتا ہے۔ ان حضرات نے مذہب کے نام پر جو انتشار پیدا کر رکھا ہے، اگر ملت کو اس سے نجات مل جاتی تو اس کا سفینۂ حیات کہیں کا کہیں پہنچ چکا ہوتا۔ انہی کے پیدا کردہ انتشار کا نتیجہ ہے کہ قوم حصولِ پاکستان کے مقاصد سے دور ہٹتی چلی گئی اور اس کے لئے یہ سمجھنا تک مشکل ہو گیا ہے کہ ہم نے پاکستان مانگا کیوں تھا؟ اور قوم کے اسی انتشار ذہنی سے فائدہ اٹھا کر ہمارے یہ بزرگ لیڈر "بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے ہیں کہ مطالبۂ پاکستان کا جذبۂ محرکہ کیا تھا۔ ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ معمارانِ پاکستان، علامہ اقبالؒ، اور قائد اعظمؒ نے کس طرح اس حقیقت کی وضاحت کر دی تھی کہ ایک جداگانہ مملکت کے مطالبہ سے ہمارا مقصد کیا ہے۔ انہوں نے اس مقصد کو اس قدر وضاحت سے بیان کیا اور اس طرح باصرار و تکرار دہرایا تھا کہ ہندوستان کا ہندو تک بھی اس سے بخوبی آشنا ہو گیا تھا۔ مثلاً یکم نومبر ۱۹۴۲ء کو لدھیانہ میں "اکھنڈ بھارت کانفرنس" کے صدارتی خطاب میں مشہور کانگریسی رہنما مسٹر منشی نے کہا تھا کہ

> تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان ہے کیا؟ نہیں معلوم تو سن لیجئے کہ پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ علاقوں میں اپنے لئے ایسے (HOME LANDS) بنائیں جہاں زندگی اور طرزِ حکومت قرآنی اصولوں کے ڈھانچے میں ڈھل سکیں اور جہاں اردو ان کی قومی زبان بن سکے مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایک ایسا خطۂ ارض ہوگا جہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔ (ٹریبون۔ ۲ ۱۱/۴۲)

جب ان حضرات کے سامنے یہ حقائق پیش کئے جاتے ہیں تو ان سے اس کے جواب میں اور تو کچھ بن نہیں پڑتا وہ کمال جرأت و بیباکی سے کہہ دیتے ہیں کہ اصل بات یہ ہے کہ

منافقت کا الزام

پاکستان کی تشکیل کا اصل مقصد تو سیاسی اور معاشی اقتدار حاصل کرنا تھا۔ لیکن اس مطالبہ کو عوام کے سامنے جذباتی اور مذہبی سوال بنا کر پیش کیا گیا تاکہ اس سے یہ عوامی تحریک بن سکے۔

یہ تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ اقبالؒ اور جناحؒ کے عطا کردہ پاکستان میں رہتے ہوئے کوئی "پاکستانی" ان جلیل القدر شخصیتوں پر ایسا الزام عاید کرسکیگا جس کی جرأت غیروں کو بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس الزام کی زد سب سے زیادہ قائداعظمؒ پر پڑتی ہے کہ "انہوں نے سیاسی اور معاشی اقتدار کے حصول کے لئے مطالبۂ پاکستان کو جذباتی اور مذہبی نقاب پہنایا اور اصل غرض و غایت سب کی نگاہوں سے اوجھل رکھی"۔ سنیئے کہ جناحؒ کے بارے میں غیروں کی رائے کیا تھی۔ مشہور کتاب (VERDICT ON INDIA) کے مصنف بیورلی نکلس نے کچھ عرصہ پہلے اپنے ایک بیان میں کہا تھا۔

> میں نے بیس سال پہلے پاکستان کی حمایت میں قلم اٹھایا اور ایک دنیا میری مخالف ہو گئی۔ لیکن میں نے پاکستان کی حمایت میں جو کچھ لکھا تھا اس کی صداقت پر مجھے اس لئے یقین تھا کہ میں مسٹر جناح کو جانتا تھا اور اگر پاکستان کی نئی نسل کے دل میں پاکستان کی محبت کم ہو رہی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ جناحؒ سے واقف نہیں۔

یہ ہے جناح کی عظمت کردار کی شہادت غیروں کی بارگاہ سے۔

ہماری قومی زندگی کا المیہ اب یہی نہیں رہا کہ نئی نسل جناحؒ سے واقف نہیں بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر دلدوز حادثہ یہ ہے کہ انہیں اب یہ بتایا جارہا ہے کہ وہ ساری عمر منافقت سے کام لیتا رہا اور سیاسی و معاشی اقتدار کے لئے عوام کے مذہبی جذبات سے کھیلتا رہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

لیکن نئی نسل کو جناح کی شخصیت سے اس قدر بے خبر رکھنے کا ذمہ دار کون؟ اس کے ذمہ دار ہم خود ہیں کہ ہم نے نئی نسل کو تاریخ کی یہ عظیم حقیقت سمجھانے کی کوشش نہیں کی کہ اس مملکت کا حصول جناحؒ کی درخشندہ سیرت و کردار کے بغیر ممکن ہی نہیں تھا۔ یہ اس کی سیرت و کردار کی بلندی تھی جو انگریز اور ہندو کی منظم قوتوں کو شکست پر شکست دیتی چلی گئی۔

اقبالؒ نے قرآن کریم کے گہرے مطالعہ سے اس حقیقت کو پالیا کہ اسلام کبھی ایک زندہ دین (نظام حیات) نہیں بن سکتا جب تک اسے عمل میں لانے کے لئے ایک آزاد مملکت نہ ہو۔ قائداعظمؒ نے اس حقیقت کو اقبالؒ سے سمجھا اور انہیں اس کا ایسا پختہ یقین ہو گیا کہ اس نظریئے نے ان کے نزدیک ایمان کی حیثیت اختیار کرلی۔ جناحؒ کے کیریکٹر کا یہ تابندہ پہلو دوست دشمن ہر ایک کے سامنے تھا کہ وہ اپنی گفتار و کردار میں منافقت نہیں برتتے تھے۔ وہ جب تک نیشنلزم کے قائل رہے کھلے بندوں کانگریس کے ساتھ رہے۔ جب ان پر اس نظریہ کا ابطال واضح ہو گیا تو وہ کانگریس میں اپنی بلند پوزیشن کے باوجود سب کچھ چھوڑ چھاڑ الگ ہو گئے۔ اور جب ان کے سامنے اسلام کا یہ تصور آیا تو وہ اسی قلندرانہ انداز میں "لگی لپٹی رکھے بغیر" مطالبۂ پاکستان کے داعی بن گئے۔ لہٰذا مطالبہ

پاکستان کی بنیاد:۔

(۱) نہ ہندو کی تنگ نظری تھی؛ اور نہ ہی انگریز کی کوئی حکمت عملی۔

(۲) نہ اس کا مقصد محض معاشی اور سیاسی اقتدار حاصل کرنا تھا، اگرچہ ظاہر ہے کہ جب اپنی آزاد مملکت وجود میں آئے گی تو اس میں سیاسی اور معاشی اقتدار لازماً حاصل ہو جائیگا۔ لیکن کسی اسکیم میں اس قسم کے مفادات کا ضمناً حصول اور بات ہے، اور ان کا اساس و بنیاد ہونا اور بات۔

(۳) مطالبہ پاکستان کی اساس و بنیاد یہ حقیقت تھی کہ ہم اسلام کے مطابق زندگی بسر کر ہی نہیں سکتے جب تک ہماری اپنی آزاد مملکت نہ ہو۔ اسلام سے مراد تھیاکریسی نہیں جس میں امور مملکت کو اسلامی یا غیر اسلامی قرار دینے کا آخری اختیار مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم اسی اشاعت میں چند صفحات آگے چل کر بتائیں گے۔ اسلامی مملکت میں مذہبی پیشوائیت کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ اس میں امت، قرآنی اصولوں کی غیر متبدل چاردیواری کے اندر رہتے ہوئے، قوانین و ضوابط خود مرتب کرتی ہے۔ اسی کا نام نظریہ پاکستان ہے۔ اسی کو اسلامی نظام کہا جاتا ہے۔ اسی سے قرآن کا معاشی نظام مرتب ہوگا۔ اور (قائداعظم رح کے الفاظ میں) قرآن کے یہی غیر متبدل اصول، ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کریں گے۔

جب تک اہل پاکستان، قرآن کریم کو اپنی سیاست کی اساس قرار نہیں دیتے، نہ ملک میں پیدا شدہ موجودہ انتشار ختم ہو سکتا ہے۔ نہ یہاں اسلامی نظام قائم ہو سکتا ہے، نہ کوئی ایسا آئین وضع ہو سکتا ہے جسے اسلامی کہا جا سکے۔ اور نہ ہی ایسے قوانین مرتب ہو سکتے ہیں جن کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر کیا جا سکے۔ اور نہ ہی وہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے جس کے لئے پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔ یہی ہم ار اگست کا پیغام ہے۔

باقی رہے ہمارے یہ خزاں رسیدہ بزرگ، جو اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن کے ذریعے مطالبہ پاکستان کی اصل و غایت کے متعلق بھانت بھانت کی بولیاں بولتے رہتے ہیں۔ ان کی خدمت میں ہم عرض کرینگے کہ ان کی حیثیت اب آثار قدیمہ کی سی ہے، جن کی خاموشی میں ان کے وقار کا راز پوشیدہ ہوتا ہے۔ ان کے حق میں بہتر یہی ہے کہ وہ خاموشی سے زندگی کے باقی دن پورے کریں۔ اور اس قسم کی غلط بیانیوں سے نہ قوم کو بہکائیں اور نہ ہی اپنی عاقبت خراب کریں۔ مطالبہ پاکستان کی غرض و غایت ان کے بیانات کی رہین منت نہیں۔ اس کی وضاحت کے لئے پاکستان میں کافی سرمایہ موجود ہے (اگرچہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نے اس سے چنداں فائدہ نہیں اٹھایا)۔ باقی رہا طلوع اسلام، سو اسے اس مقصد کے لئے کسی گوشے کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔

اس کے اُس زمانے کے قائل' اس حقیقت کی زندہ شہادت ہیں' اور قوم نے جب بھی تحریکِ پاکستان کی صحیح اور قابلِ اعتماد تاریخ مرتب کرنے کی ضرورت محسوس کی' اس شہادت کو سب سے نمایاں مقام حاصل ہوگا۔

پاکستان اور قرآن کا رشتہ' ارتباطِ لفظ و معنیٰ' اختلاطِ جسم و جاں کا سا ہے۔ اس سے قرآن کو جدا کر دینے کا مطلب یوں سمجھئے جیسے سورج سے روشنی اور حرارت کو الگ کر دیا جائے۔ اس کے بعد یہ زیادہ سے زیادہ بے جان پتھروں، بے برگ و گیاہ صحراؤں اور بھیانک غاروں کا نگاہ فریب "چاند" بن کر رہ جائے گا۔ انسانیت کے لئے زندگی اور روشنی کا سرچشمہ نہیں بن سکیگا۔

(۱)

خانہ برانداز چمن

يُخْرِبُونَ بُيُوتَهُمْ بِأَيْدِيهِمْ ۔ (۵۹/۲)

وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے گھروں کو تباہ کر رہے ہیں۔

آنے والا مورخ جب مملکتِ خداداد پاکستان کی بربادی کی عبرت انگیز و خونچکاں داستان رقم کریگا تو اس میں شیخ مجیب الرحمٰن کا نام سرفہرست دکھائی دے گا۔ تحریکِ پاکستان کے دوران' مسلمانوں سے کہا جاتا تھا کہ قیامِ پاکستان سے تمہیں ہندو کی غلامی سے آزادی مل جائے گی۔ یہ بات قابلِ فہم تھی۔ لیکن شیخ صاحب نے خود پاکستان کے ایک حصہ (مشرقی بنگال) میں بسنے والے مسلمانوں کے دل میں یہ زہر بھرنا شروع کیا کہ تمہیں غیر بنگالی مسلمان کھا گئے ہیں۔ میں تمہیں ان کی غلامی سے نجات دلاؤں گا۔ خود ایک مملکت میں بسنے والے مسلمانوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف' تعصب' نفرت اور عداوت کی یہ آگ اس طرح سلگائی گئی کہ رفتہ رفتہ وہ شعلہ جوالہ بن گئی اور باہمی منافرت کو اس شدت تک لے جا کر' شیخ صاحب نے اپنے چھ نکات پیش کر دیئے جس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ پاکستان کے مشرقی حصہ کو ایک جداگانہ آزاد مملکت بنا دیا جائے۔

اُدھر یہ آگ بھڑکائی گئی اور اِدھر یہ تحریک چلائی گئی کہ مغربی پاکستان کی وحدت کو توڑ کر اس خطہ کو مختلف صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اس تحریک کی ذمہ داری بھی شیخ صاحب کے سر پر عاید ہوتی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ مغربی پاکستان کے جن لوگوں کی طرف سے یہ مطالبہ ابھارا گیا تھا وہ چل رہے تھے شیخ صاحب کے نقشِ قدم پر ہی۔ شیخ صاحب کی اسکیم تو آنے والے آئین کی منتظر ہے لیکن وحدتِ پاکستان کو کالعدم قرار دینے کی اسکیم پہلے ہی بروئے کار آ چکی ہے۔ اس وحدت کے ٹوٹنے کے بعد' شیخ صاحب اِدھر تشریف لائے ہیں اور ان صوبوں کے کان میں یہ سحر پھونک رہے ہیں کہ جس قسم کی خود مختاری بنگال کو حاصل ہوگی اسی قسم کی آزادی'

ہم تمہیں بھی دلائیں گے۔ اس اسکیم کا عملی مفہوم یہ ہو گا کہ یہاں ایک کے بجائے پانچ خود مختار ریاستیں وجود میں آ جائیں گی، اور جسے مملکتِ پاکستان کہا جاتا ہے اس کا وجود ختم ہو جائے گا ـــ مملکت نام ہی ایک مضبوط مرکز کا ہوتا ہے۔ جب مرکز کی حیثیت ایسی رہ جائے جیسے خط پر ریسما ریٹ لکھا جاتا ہے، تو ظاہر ہے کہ ایسی مملکت کا عدم و وجود برابر ہوتا ہے۔ جس روز بد کو یہ اسکیم (خاکم بدہن) عمل میں آئے گی، ہندوؤں کے ہاں گھی کے چراغ جلیں گے۔ اور دیگر ممالک جن کی آنکھوں میں پاکستان کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے، مسرت کے شادیانے بجائیں گے ـــ آسمان کی آنکھ نے امتِ مرحومہ کی تباہی اور بربادی کے بڑے بڑے جگر پاش اور الم انگیز مناظر دیکھے ہیں لیکن ہمارے نزدیک اس ساختہ ہوش ربا سے بڑا حادثہ فاجعہ اس نے کبھی نہیں دیکھا ہو گا ـــ وہ مملکت جسے اس قدر حسین تمناؤں، اور مقدس آرزوؤں کی آماجگاہ بننے کے لئے حاصل کیا گیا تھا، وہ ربع صدی سے بھی پہلے یوں خواب پریشان بنکے رہ جائے۔ ایسے قیامت خیز حادثہ کی مثال ہماری تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔

یہ ہیں شیخ مجیب الرحمٰن صاحب۔ اور اس سادہ دل قوم کی حالت یہ ہے کہ یہ ان کے جلوس نکالتی ہے اور ان کے اعزاز میں استقبالئے دیتی ہے۔ لیکن اس میں قوم کا کیا قصور؟ اس قوم کے "لیڈروں" نے اس میں اتنا سیاسی شعور بیدار ہی نہیں ہونے دیا کہ یہ سمجھ سکے کہ فلاں تحریک کا مقصود کیا ہے اور فلاں اسکیم کا مآل کیا؟ اس وقت کرنے کا کام یہ تھا کہ یہ حضرات قوم کو اس اسکیم کے مضمرات سے آگاہ کرتے اور انہیں بتاتے کہ اس سے کس طرح پاکستان کا نام و نشان تک صفحۂ تاریخ سے حرفِ مکرر کی طرح مٹ جائیگا۔ لیکن ان لیڈروں کو اس سے کیا غرض۔ ان کے سامنے ایک ہی مقصد ہے۔ اور وہ یہ کہ آنے والے الیکشن میں انہیں زیادہ سے زیادہ نشستیں حاصل ہو جائیں تاکہ اقتدار کی کرسیاں ان کے ہاتھ میں آ جائیں۔ پاکستان جائے بھاڑ میں اور قوم پڑے چولہے میں!

کسی کو رنگ سے مطلب کسی کو خوشبو سے
گلوں کے چاکِ گریباں کی بات کون کرے؟

لیکن ان حضرات کی کوتاہ نگہی اور ہوسِ اقتدار کی فریب انگیزی انہیں اتنی سی بات سمجھنے کی بھی فرصت نہیں دیتی کہ جب پاکستان کا خطہ زمین ہی نہیں رہے گا تو تمہارے اقتدار کی کرسیاں بچھیں گی کہاں؟

سچ ہے جس قوم کی تباہی کے دن قریب ہوں اس کے اربابِ دانش کی عقلوں کے چراغ گل ہو جاتے ہیں اور انہیں امنڈتے ہوئے سیلاب بھی دکھائی نہیں دیتے! یا للعجب!!　　(محررہ ۱۵ جولائی ۱۹۷۰ء)

(اس وقت ہم اس موضوع پر اس سے زیادہ کچھ لکھنا ضروری نہیں سمجھتے۔ ون یونٹ کی تنسیخ اور مجیب الرحمٰن صاحب کی اسکیم کے سلسلہ میں ہم تفصیل سے آئینِ پاکستان کے سلسلہ میں لکھیں گے۔)

کفر و اسلام کی جنگ

قرآن کریم نے، مدعیانِ خدا پرستی کے ایک گروہ کے متعلق کہا ہے کہ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَاءَكُمْ ظِهْرِيًّا (۱۱/۹۲) تم نے خدا کو ایک طرف بطور ظِهْرِيًّا رکھ چھوڑا ہے۔ عرب اپنے قافلے میں احتیاطاً ایک آدھ اونٹ فالتو رکھ لیتے تھے کہ عندالضرورت اس سے کام لے لیا جائے۔ اسے وہ ظِهْرِيًّا کہتے تھے۔ آجکل کی اصطلاح میں اسے (EXTRA) کہیں گے۔ جیسے کھیل کی ٹیم میں، یا فلموں میں ایکسٹرا رکھے جاتے ہیں۔ وہ خدا پرستی کے ان مدعیوں کے متعلق کہتا ہے کہ وہ خدا سے ویسے تو کوئی واسطہ نہیں رکھتے لیکن احتیاطاً اسے ساتھ رکھ چھوڑتے ہیں کہ جب اور حربے فیل ہو جائیں تو اس سے کام لے لیا جائے۔ مذہب پرست طبقہ کے نزدیک خدا کا یہی مقام ہوتا ہے۔ وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے مختلف ذرائع استعمال کرتے ہیں اور جب دیکھتے ہیں کہ وہ ذرائع ناکام ہو رہے ہیں تو پھر خدا کا نام سامنے لے آتے ہیں۔ آجکل ہمارے ہاں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ اس وقت مختلف پارٹیوں کی قوتیں، الیکشن جیتنے کے لئے صرف ہو رہی ہیں۔ اس کے لئے ہر پارٹی اپنی اپنی بساط کے مطابق مختلف ذرائع استعمال کر رہی ہے۔ لیکن مذہب کے اجارہ داروں کی کیفیت یہ ہے کہ وہ جہاں اپنا پلڑا ہلکا دیکھتے ہیں اور فریقِ مخالف کا بھاری، فوراً پکار اٹھتے ہیں کہ یہ کفر اور اسلام کی جنگ ہے، ہم اسلام کی خاطر مصروفِ پیکار ہیں اور فریقِ مخالف کفر کے راستے پر گامزن ہے۔ یوں یہ لوگ اسلام کو بطور ظہری استعمال کر رہے ہیں۔

یاد رکھئے۔ یہاں کفر اور اسلام کی کوئی جنگ نہیں۔ یہاں اسلام ہے ہی نہیں تو اس کی کفر کے ساتھ جنگ کیا ہوگی؟ یہاں مسلمان بستے ہیں اور کسی پارٹی کا یہ کہنا کہ ہم مومن ہیں اور دوسرے کافر، محض دھاندلی ہے۔ ہم میں اچھے لوگ بھی ہیں اور بُرے بھی، اور اچھے اور بُرے مختلف پارٹیوں کے اندر بھی ہیں اور ان سے باہر بھی۔ لہٰذا کسی پارٹی کا یہ دعویٰ بھی ادعائے باطل ہے کہ ملک کے تمام اچھے لوگ ہم نے چُن لئے ہیں اور بُرے دوسروں کے حصے میں آ گئے ہیں۔ اگر پرکھا جائے تو ہو سکتا ہے کہ اس قسم کے دعویٰ کرنے والوں کے ہاں بُرے لوگوں کی تعداد، دوسروں کے مقابلہ میں کچھ زیادہ ہی نکلے۔

جہاں تک نماز، روزے کا تعلق ہے سو اس باب میں حضرت عمرؓ کا وہ قول کسے یاد نہیں۔ ایک شخص آپ کے پاس آیا اور کہا کہ فلاں آدمی بڑا نیک ہے۔ آپ نے اس سے کہا کہ کیا تم کبھی اس کے پڑوس میں رہے ہو؟ اس نے کہا کہ نہیں۔ پھر آپ نے پوچھا کہ کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ سفر کیا ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں۔ پھر آپ نے کہا کہ کیا تم نے کبھی اس سے لین دین کا معاملہ کیا ہے؟ اس پر بھی اس نے کہا کہ نہیں۔ تو آپ نے ڈانٹ کر کہا کہ پھر تم نے اسے مسجد میں سر اٹھاتے سر جھکاتے دیکھا ہوگا۔ تم یہ کہو کہ وہ بڑا نمازی ہے۔ یہ کیوں کہتے ہو کہ بڑا نیک

اور شرانگیز ہے۔

اب رہا یہ دعویٰ کہ ہم یہاں اسلامی نظام نافذ کرنا چاہتے ہیں اور دوسری پارٹیاں کفر کا نظام — سو یہ بھی ایک طرف پندارِ نفس اور دوسری طرف تہمت تراشی ہے۔ ملک کی کوئی پارٹی بھی ایسی نہیں جس نے یہ کہا ہو کہ وہ اسلامی نظام نہیں چاہتی۔ کفر کا نظام لانا چاہتی ہے۔ نہ ہی ان میں سے کسی پارٹی کے سربراہ نے یہ کہا ہے کہ اس کا اسلام پر ایمان نہیں۔ اس سلسلہ میں کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ لوگ منافق ہیں۔ یہ درحقیقت کفر کا نظام لانا چاہتے ہیں لیکن زبان سے ایسا کہتے نہیں۔ سو یہ پہلے سے بھی شدید تر زیادتی ہے۔ آپ نے کیا ان کا سینہ چیر کر نفاق واخلاص کی پرکھ کر لی ہے؟ اور اگر سوال تمہارے قیاس کا ہے، تو یہی کچھ فریقِ مخالف آپ کے متعلق کہہ سکتا ہے۔

لہٰذا، آپ ان لوگوں کے فریب میں نہ آئیے جو کہتے ہیں کہ یہاں کفر اور اسلام کی جنگ ہو رہی ہے۔ یہاں مسلمانوں کی مختلف پارٹیوں میں الیکشن کے لئے رسّہ کشی ہو رہی ہے جس کا کفر اور اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ "خدا" ان میں سے کسی کے بھی ساتھ نہیں۔ جہاں تک "سوشلزم" کے خلاف محاذ کا تعلق ہے، سو (جیسا کہ ہم متعدد بار وضاحت سے لکھ چکے ہیں) سوشلزم کے حامی اس اصطلاح کو اختیار کرنے میں اجتہادی غلطی کر چکے ہیں اور اب اپنی بات کی پیچ میں اس پر اڑے ہوئے ہیں۔ ہم نے ان میں سے کسی کو یہ کہتے نہیں سنا کہ ہم اسلام کو تیاگ کر پاکستان میں وہ ملحدانہ فلسفۂ زندگی رائج کرنا چاہتے ہیں جسے مارکس اور لینن نے وضع اور اختیار کیا تھا۔ اس کے برعکس یہ حضرات بار بار اسلام پر اپنے ایمان کا اعلان کرتے ہیں۔ ہم نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ وہ اس امر کا اعلان کر دیں کہ سوشلزم سے ہماری مراد وہ فلسفۂ حیات نہیں جو اسلام کی ضد ہے۔ اس سے ہمارا مقصد صرف وہ معاشی نظام ہے جسے سوشلزم کہہ کر پکارا جاتا ہے اور جو قرآن کے معاشی نظام سے ملتا جلتا ہے۔ اگر یہ حضرات ایسا اعلان کر دیتے تو فریقِ مخالف کو ان کے خلاف اس قدر غلط فہمیاں پھیلانے کا موقعہ نہ ملتا۔ بایں ہمہ جب یہ لوگ بار بار اعلان کرتے ہیں کہ اسلام پر ہمارا ایمان ہے تو کسی کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ ان کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کرے۔ جہاں تک سوشلزم کے معاشی نظام کا تعلق ہے، اسے تو جماعتِ اسلامی بھی اپنے منشور میں اختیار کر چکی ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ سوشلزم کے حامی کھلے بندوں ایسا کہتے ہیں اور یہ حضرات حسبِ معمول اپنی "حکمتِ عملی" کی اوٹ میں — چوں نہادے کہ بہ بزم شراب می آید!

باقی رہا منٹوی، سو اگر آج امریکہ کی چین کے ساتھ صلح ہو جائے تو سوشلزم کا کفر اسلام سے بدل جائے گا۔

ان خدا پرستوں کے کفر اور اسلام کے متعلق غالب بہت پہلے کہہ گیا ہے کہ

چاک مت کر جیب بے ایامِ گل
کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیئے

(باقی)

بیس سال پہلے کی بات

جشنِ آزادی

تشکیلِ پاکستان کے بعد چند سالوں تک، ہم ہر سال ۱۴ر اگست کے جشنِ آزادی کی تقریب پر قوم کے سامنے ایک آئینہ رکھا کرتے تھے تاکہ وہ اس میں دیکھ سکے کہ ہم نے گزشتہ سال میں کیا کیا ہے اور آج ہماری حالت کیا ہے۔ ۱۹۶۸ء کے پہلے جشنِ آزادی کی تقریب پر ہم نے جو محاسبۂ خویش پیش کیا تھا، اسے ہم دو سال پہلے اپنی صفحات پر دوبارہ سامنے لا چکے ہیں۔ اشاعتِ حاضرہ میں ہم ۱۹۴۹ء اور ۱۹۵۰ء کے جشنوں کی تقاریب پر پیش کردہ محاسبہ کو دہراتے ہیں۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ ہم دیکھیں کہ آج سے بیس سال پہلے ہماری حالت کیا تھی اور آج ہم کس مقام پر کھڑے ہیں۔ اگر صورت یہ ہے کہ اس بیس سال کے عرصہ میں ہم پہلے سے بھی زیادہ گہری پستیوں میں گر چکے ہیں، تو اس سے ہم اپنے مستقبل کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اس کے دل سے پوچھئے، اس کے جگر سے پوچھئے
آج جس کی منزلِ مقصود کل سے دور ہو!

۱۹۴۹ء میں، عید الفطر اور یومِ آزادی کے جشن یکے بعد دیگرے منائے گئے تھے اس لئے اس سال ہمارا پیغام بھی دوہرا تھا۔ آپ ان پیغامات کو پڑھئے، اور پھر اس آئینہ میں اپنی آج کی شکل دیکھئے۔

شاید کہ خود را باز آفرینی!

(۱)

"زیرِ نظر پرچہ جب آپ کے ہاتھوں میں ہوگا تو آپ ایک جشن منانے سے فارغ ہو چکے ہوں گے اور دوسرا جشن منانے کی تیاریاں کر رہے ہوں گے۔ ایک "دینی" جشن، ایک "دنیاوی" جشن۔ ایک عید الفطر کا جشن اور دوسرا ۱۵ر اگست کو جشنِ آزادی۔ طرب و نشاط کے مواقع اور جشن و مسرت کی تقاریب پر، آلام و مصائب کے تذکرے اور دکھ اور درد کی داستانیں موزوں نہیں سمجھی جایا کرتیں، لیکن

دل کا خوں آنکھوں میں کھنچ آئے تو کیا اس کا علاج
نالہ روکا تھا کہ یہ پردہ درِ رازِ نہ ہو

وہ آنسو جو آنکھ کے آبگینے سے بے اختیار چھلک پڑے اسے خونابۂ دل کی طرف واپس لوٹا دینا کس کے بس کی بات ہے۔ جب سینہ، ہجوم مصائب اور انبوہِ آلام سے تمام داغ داغ ہو رہا ہو تو اس ناسور کو رسنے سے کون روک سکتا ہے۔ جشن ومسرت کے اس قسم کے ہنگامے تو بربطِ تحت الشعور میں سوئے ہوئے المیہ نغمات کے جگانے کے لئے مضراب بن جاتے ہیں اور جب کیفیت یہ ہو کہ

نغمے بیتاب ہوں تاروں سے نکلنے کے لئے

تو پھر ہمارے یہ دکھ بھرے گیت آپ کی طربِ نشاط کی محفلوں کو سوگوار بنا دیں تو ہم معذور ہیں۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں

اور حقیقت تو یہ ہے کہ آپ سمجھیں یا نہ سمجھیں۔

مرا رونا نہیں رونا ہے یہ سارے گلستاں کا

اگر آپ اپنے آپ کو دھوکے میں رکھنا چاہتے ہیں اور جھوٹی ہنسی کا نام شگفتگی قلب اور بشاشتِ نگاہ رکھ لیتے ہیں تو اس سے حقیقت تو نہیں بدل جائے گی۔

جشنِ عید

آپ ابھی ابھی جشنِ عید سے فارغ ہوئے ہیں۔ لیکن ہم پوچھتے ہیں اور آپ سینہ پر ہاتھ رکھ کر ہمیں بتائیے کہ کیا آپ نے کبھی سوچا بھی ہے کہ بالآخر یہ عید ہے کیا اور اس تقریب کو کیوں منایا جاتا ہے۔ رمضان کیا ہے؟ اور روزے کس لئے رکھے جاتے ہیں۔ اگر آپ نے ان امور کو درخورِ غور وتفکر نہیں سمجھا اور عید کی تقریب اس لئے مناتے ہیں کہ یہ اسی طرح سے منتی چلی آ رہی ہے تو کیا آپ کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اسے فی الواقعہ جشنِ مسرت سے تعبیر کریں۔

قوم کے ایک کثیر طبقہ کی (جس میں غریبوں کی اکثریت ہوتی ہے) "مذہب" سے شیفتگی اور وابستگی کا اب تک یہ عالم ہے کہ گھر میں کھانے کو نہیں، حتیٰ کہ گھر تک بھی نہیں، سر چھپانے کا آسرا نہیں۔ پیہم فاقوں سے بدن میں قوتِ مدافعت نہیں، جسم میں خون کا نشان تک نہیں۔ دن بھر چلچلاتی دھوپ میں مشقت کرتے ہیں تو بمشکل نانِ جویں نصیب ہوتی ہے۔ وہ بھی التزاماً نہیں۔ یہ حالات ہیں اور "مذہب" سے وابستگی کی یہ کیفیت ہے کہ رمضان آتا ہے تو نہایت پابندی سے روزے رکھتے ہیں۔

غریبوں کے روزے

سحری کے لئے اٹھتے ہیں تو بسا اوقات صرف پانی پی کر روزے کی نیت باندھ لیتے ہیں کہ گھر میں کچھ کھانے کو نہیں۔ اگر کچھ ملتا ہے تو وہ سوکھی روٹی سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ یوں روزہ رکھتے ہیں اور دن بھر دھوپ میں محنت کرتے ہیں۔ شام کو انہیں دیکھئے تو ضعف واضمحلال

سے ان پر مردنی چھا رہی ہوتی ہے۔ افطار کے لئے انہیں نمک سے زیادہ کچھ نہیں ملتا۔ دن بھر کی کمائی سے بمشکل دال روٹی نصیب ہوتی ہے۔ رات کو گیارہ بجے تک نماز اور تراویح سے فارغ ہوتے ہیں۔ تین چار بجے پھر اٹھ بیٹھنا ہوتا ہے اور دن بھر سونے کے لئے کوئی وقت نہیں ملتا۔ ان حالات میں اللہ کے یہ بندے روزے رکھتے ہیں۔

آپ سوچئے کہ جس قوم کا عزم ایسا راسخ ہو اور تکالیف برداشت کرنے کی ہمت ایسی کوہ شکن، وہ قوم دنیا میں کیا کچھ نہیں کر سکتی؟ لیکن مولوی ان کا خیال تک بھی اس طرف آنے نہیں دیتا۔ وہ انہیں یہ کہہ کر سلاتے رکھتا ہے کہ یہ تمام "اعمال" تمہارے "اعمال نامہ" میں لکھے جا رہے ہیں۔ قیامت میں ان سب کا "وزن" ہوگا۔ اور جس کا پلڑا بھاری ہوگا اُسے جنت میں بھیج دیا جائے گا۔ باقی رہی یہ دنیا، سو دنیا مردار ہے اور اس کا طالب کتا۔ یہاں کوئی جس قدر ذلیل و خوار ہوگا، خدا کی نظروں میں اسی قدر مقبول و محبوب قرار پائے گا۔ یہاں جتنا غریب مفلوک الحال ہوگا وہاں اتنا ہی غنی اور مرفہ الحال ہوگا۔ یہاں کی دولت و ثروت کافروں اور "دنیا داروں" کا حصہ ہے جن کے لئے آخرت میں کچھ نہیں۔ وہ اس طرح امیروں اور سرمایہ داروں کا آلۂ کار بن کر ان غریبوں اور محتاجوں کو افیون پلائے جاتا ہے۔ اور وہی قوم جسے ان ہی نمازوں اور روزوں کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر، ملوکیت، برہمنیت اور سرمایہ داری کے ہر ملعون نظام پر برقِ خاطف بن کر گرنا تھا، اس نظام کے استحکام و استبقار کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

سب کچھ آخرت پر

یہ وہ انسانیت کش حربہ تھا جو ہمارے دورِ ملوکیت میں ایجاد ہوا۔ اور اب ہزار برس سے متوارث و متواتر چلا آرہا ہے۔ اور "اسلاف کے مسلک" کا لیبل اپنے اوپر لگا کر، مقدس و متبرک بن چکا ہے کہ جو اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے اس کی آنکھ نکال دی جاتی ہے۔ کوئی خدا کا بندہ اتنا نہیں سوچتا کہ جن "اعمال" کو خدا نے آخرت سے پہلے، اسی دنیا کی بہترین متاع کا ذریعہ قرار دیا تھا۔ جن کے متعلق واضح اور غیر مبہم الفاظ میں بتا دیا تھا کہ ان کا لازمی اور حتمی نتیجہ دنیا کی بادشاہت بھی ہے، جن کے حاملین کے متعلق برملا کہہ دیا تھا کہ دنیا کی کوئی قوت انہیں مغلوب نہیں کر سکے گی۔ جس نظام کے متعلق ساری دنیا میں اعلان کر دیا تھا کہ یہ نظام، تمام دیگر نظامہائے زندگی پر غالب رہے گا اور صرف بتا ہی نہیں دیا تھا بلکہ اس قوم نے جس نے سب سے پہلے ان "اعمال" کو ضابطۂ زندگی بنایا تھا، انہوں نے دکھا دیا تھا کہ کس طرح چند سالوں کے عرصہ میں "ایک اونٹ چرانے والی، کھجوروں کی گٹھلیوں پر گزارہ کرنے والی صحرا نشین قوم، قیصر و کسریٰ کے تخت و تاج کی مالک بن جاتی ہے۔ ان "اعمال" کے متعلق یہ کہا جا رہا ہے کہ انہیں دنیاوی جاہ و ثروت، عزت و تکریم، دولت و حشمت، قوت و حکومت سے کوئی علاقہ نہیں۔ یہ سب شان و شوکت جھوٹے نگوں کی مینا کاری ہے جو کافروں اور "دنیا داروں" کو جہنم کی طرف لے جانے کے لئے شیطان نے وضع کر رکھی ہے۔ "اللہ والے" وہی ہونگے جو سب سے زیادہ خراب و خستہ حالت میں رہیں گے۔ یہ ہے وہ افیون جسے ملوکیت، برہمنیت اور خانقاہیت کی ملّا بھگت نے وضع کیا اور جس سے قوم کے قوائے عملیہ کو اس درجہ

اس دنیا کی بادشاہت

[illegible]

مفلوج و مشکول کر دیا گیا ہے کہ اب وہ اسی موت کو عین زندگی اور اسی خواب کو عین بیداری سمجھ رہے ہیں۔

کہیئے کہ یہ مقام ماتم ہے یا ہنگام مسرت!

جب امت کے سامنے ان احکام قرآنی کی حقیقت بے نقاب تھی تو اس وقت یہی نماز اور روزے کیا نتائج مرتب کیا کرتے تھے، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ۲ھ میں پہلی بار روزے فرض ہوئے۔ انہوں نے قوم کے اندر وہ انقلاب پیدا کیا

انہی روزوں نے انقلاب برپا کر دیا تھا

کہ ابھی سترہ روزے بھی پورے نہ کئے تھے کہ پوری کی پوری ملت (جو اس وقت صرف تین سو تیرہ ۳۱۳ نفوس پر مشتمل تھی) مخالفین کی متحدہ قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے بدر کے میدان میں پہنچ چکی تھی۔ روزے قوم کی صلاحیتوں کو کس طرح بیدار اور اجاگر کرتے ہیں، اس کی شہادت بدر کے ذرات آج تک دیتے چلے آ رہے ہیں۔ یہی روزہ داروں کی وہ جماعت کہ جب وہ اس طرح فاتح و منصور واپس لوٹی ہے تو وہ اس انقلاب عظیم پر وجد و مسرت سے اپنے رب کے حضور والہانہ طور پر سجدوں میں گر گئی۔ اس تقریب کا نام تھا "جشن عید"۔ اس لئے کہ جس قوم کے ذمہ ساری دنیا سے ظلم و استبداد مٹا کر اس کی جگہ عدل و انصاف قائم کرنے کا فریضہ عاید ہو رہا ہو، ان کے جشن منانے کے انداز بھی دنیا سے نرالے ہوتے ہیں۔ ساری دنیا کا قاعدہ ہے کہ جشن و کامرانی کو عیش و عشرت کے تنوعات سے منایا جاتا ہے۔ لیکن انہیں اس موقعہ پر بھی یہ کہا گیا تھا کہ دیکھنا! فتح کی خوشی اور کامیابی کے غرور میں اپنے نصب العین کو نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دینا۔ اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَ الۡفَتۡحُ۔ جب خدا کی تائید و نصرت اور فتح و کامرانی سے تم بہرہ یاب ہو، فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ وَ اسۡتَغۡفِرۡہُ۔ تو اپنے خدا کے نظام ربوبیت کو موجب حمد و ستائش بنانے کے لئے، اور جذب و انہماک سے سرگرداں ہو جاؤ۔ (تسبیح) اور اس سے توفیق مانگو کہ تمہارے اعمال حسنہ کے بھرپور نتائج تمہاری چھوٹی چھوٹی ہر بڑی کوتاہیوں کے اثرات کو زائل کر دیں۔ (استغفار) اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا۔ کہ اس کا قانون یہی ہے کہ جب تم غلط راہوں سے منہ موڑ کر صحیح راستہ پر آ جاؤ تو ہر قدم پر منزل قریب تر ہوتی جائے گی۔ (توبہ)

یہ تھا وہ جشن مسرت جو اس فاتح و منصور قوم کو بتایا گیا تھا۔ یہ تھی پہلی عید، اور اس کے چھ سال بعد وہ عید جو فتح مکہ کے جشن کی تقریب میں منائی گئی۔ وہ مکہ جس سے یہی قوم، آٹھ سال پہلے اس طرح نکالی گئی تھی جس طرح تمہیں دو سال ادھر دہلی اور مشرقی پنجاب سے نکالا گیا تھا۔ ہم پوچھتے ہیں اس مشقت اور تکلیف سے روزے رکھنے والوں اور اس کے بعد جشن عید منانے والوں سے کہ کیا تمہارے روزے وہی نتائج پیدا کر رہے ہیں جو ان سے مقصود و متصور تھے؟ اور اگر ان سے وہ نتائج پیدا نہیں ہو رہے ہیں تو کیا تمہیں کبھی اس طرف خیال کرنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی کہ ہماری اس قدر شاق محنت جو

حاشیہ (صفحہ ۲۱): مذکرہ صاحب ضرب کلیم میں دیکھئے۔ فرعون، ملوکیت کا علمبردار تھا، ہامان، برہمنیت (PRIESTHOOD) کا نمائندہ اور قارون سرمایہ داری کا مجسمہ ہے۔ اور ان تمام بتوں کو توڑنے کے لئے عصائے موسوی۔

یوں ضائع جارہی ہے اسے نتیجہ خیز بنانے کے لئے کیا کیا جائے۔ یاد رکھئیے! اس کا صحیح جواب آپ کو مولوی کی بے روح وعظوں اور بے جان خطبوں سے نہیں ملے گا۔ کہ "مولویت" اس نظام ملوکیت و سرمایہ داری کی مؤید و مبلغ ہے جس نے اس کی تخلیق کی تھی۔ اس کا صحیح جواب آپ کو ملے گا قرآن سے جو اس نظام برہمنیت کو مٹانے کے لئے آیا تھا۔[1]

(۵)

جشنِ آزادی

"اس دینی جشن" کے بعد اب لیجئے اپنے "دنیاوی جشن" کی طرف جسے آپ جشنِ آزادی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ قوموں کی زندگی میں بعض واقعات ایسے آتے ہیں جن کی یاد قائم رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ لیکن "یاد" کوئی بت نہیں ہوتی کہ اس کی پرستش کی جائے۔ یہ ذریعہ ہوتی ہے شعورِ ملی میں اس انقلاب کو تازہ رکھنے اور آگے بڑھانے کا جس کی یاد قائم رکھی جاتی ہے۔ مسلمانانِ ہند کی ملی زندگی میں اسی قسم کا ایک انقلاب آفریں دن آیا جسے ہم یومِ آزادی کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہ دن درحقیقت ایک حدِ فاصل تھا ہماری گزشتہ اور آئندہ زندگی میں۔ یہ دن تھا اس عہد کا کہ ہماری آنے والی زندگی گزشتہ زندگی سے یکسر مختلف ہوگی۔ ہماری گزشتہ زندگی تھی غیروں کے بنائے ہوئے نظام کے تابع چلنے کی۔ وہ نظام جو موجب تھا ہمارے اخلاقی تسفل اور تعلیمی تنزل کا۔ جس نے ہمیں انسانیت سے یکسر بے بہرہ بنا رکھا تھا۔ جس نے انسانوں کی دنیا کو درندوں کا بھٹ بنا رکھا تھا۔ جس میں ہر سرمایہ دار غریبوں کی محنت کے اثمار و نتائج پر سانپ بن کر بیٹھا رہتا تھا۔ جس میں مزدوروں کے خون کی سرخی، اربابِ ثروت کے عشرت کدوں کی رنگینی کا سامان فراہم کرتی تھی۔ جس میں غریبوں کی ہڈیاں، امراء کے قصرِ تعیش کے لئے چونا بنتی تھیں۔ وہ نظام جس نے ہمیں انسانیت سے بہت نیچے گرا کر، حیوانیت کی سطح پر لا کھڑا کیا تھا۔ بلکہ اس سے بھی نیچے۔ دو لفظوں میں یوں کہئے کہ وہ نظام جس نے ہمیں خیر و برکت کے سرچشمۂ ابدی ذاتِ خداوندی سے بہت دور پھینک دیا تھا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کا دن اس اعلان کا دن تھا کہ جاء الحق و زھق الباطل۔

کسوٹی تبدیلی؟

وہ انسانیت سوز نظام ختم ہوا اور اب اس کی جگہ ایک نئے نظام کا دور شروع ہوا جس کا سرنامہ احترامِ آدمیت ہے۔ کسی کو اس اعلان پر شبہ ہو تو ہو، لیکن یہ حقیقت ہے کہ قوم نے اس اعلان کو بالکل ایسا سمجھا تھا۔ اس نے دس سال اسی "اعلان" کی خاطر جد و جہد کی تھی۔ ہم نے اپنے دعوے کی بنیاد اسی اعلان پر رکھی تھی اس لئے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کا دن اسی اعلان و اعلام کا دن تھا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو

[1] واضح ہے کہ مولوی سے ہماری مراد کوئی خاص شخص یا اشخاص کی جماعت نہیں بلکہ یہ اس ذہنیت کا نام ہے جو ہمارے دورِ ملوکیت میں پیدا ہوئی اور جس نے شعوری اور غیر شعوری طور پر اس نظامِ زندگی کو پھر سے زندہ اور مستحکم کر دیا جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔ یہ ذہنیت تقلیدِ آبا کی اندھی روش سے متوارث چلی آرہی ہے اور اس کے مظہر کا نام ہے مولوی۔

اس کی پہلی سالگرہ منائی گئی۔ اور اب ۱۵ اگست ۱۹۴۹ء کو دوسری منائی جا رہی ہے۔

ہم کسی تفصیل میں الجھے بغیر، پاکستان کے تمام اصاغر و اکابر سے خدا کے نام پر پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا فی الواقعہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کا دن ہماری پہلی اور بعد کی زندگی میں حد فاصل بن گیا تھا اور کیا اس کے بعد ان دو برسوں میں تم نے اس حد سے دو قدم آگے بڑھائے ہیں؟ اس کا جواب باہر سے نہ مانگئے، خود اپنے دل سے مانگئے۔ اقرأ کتابک کفی بنفسک الیوم علیک حسیبا۔ (۱۷/۱۴)۔ اپنا اعمالنامہ پڑھو ۔۔۔ کہ یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے ۔۔۔ اور پھر کسی اور سے شہادت طلب نہ کر بلکہ اپنے آپ سے پوچھ کہ آج خود تیری ذات تیرے محاسب کے لئے کافی ہے۔ یوں محاسبہ کر اور پھر سوچ کہ کیا تیری غیرت گوارا کرتی ہے کہ تو اس مزعومہ "حد فاصل" کی یاد میں جشنِ مسرت منائے؟ اگر آپ کا دل فی الواقعہ گواہی دیتا ہے کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کا دن، ہماری زندگی میں ایک حد فاصل بن گیا تھا اور اس کے بعد ہم اس حد سے برابر آگے بڑھتے جا رہے ہیں تو آپ کو زیب دیتا ہے کہ اس دن کی یاد میں چراغاں کیجئے، جشن منائیے۔ ساری دنیا کو اس انقلاب عظیم پر دعوتِ فکر و نظر پیش کیجئے۔ اپنی آنے والی نسلوں کے سامنے سر اٹھا کر چلئے۔ لیکن اگر آپ کا دل اس کی گواہی نہیں دیتا تو اپنے آپ کو دھوکہ میں نہ رکھیئے کہ یہ دھوکہ تمہیں اپنوں اور بیگانوں سب کی نظروں میں ذلیل کر دے گا۔

ہے کوئی خدا کا ایسا بندہ جو اپنے دل کی سچی سچی گواہی کو ۱۵ اگست کے دن ساری ملت کے سامنے اعلانیہ پیش کر دے!

تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن!"

―――― (۰) ――――

جشنِ آزادی ۱۹۵۰ء

ظہر الفساد فی البر و البحر

زندگی کے ہر گوشہ میں ناہمواریاں نمودار ہو گئیں

"مقامِ مسرت و اطمینان ہے کہ علی رغم انف عدو سرزمین پاکستان پر زندگی کا تیسرا سال بھی خیریت سے گزر گیا اور اس کے بدخواہوں نے اس سرزمین کی تباہی کے لئے جو منصوبے باندھ رکھے تھے وہ ان کی ہزار آرزوؤں اور کوششوں کے باوجود خاسر و نامراد رہے۔

برین مژدہ گر جاں فشانم رواست

دوسروں کے لئے پاکستان کی سرزمین شاید اس لئے عزیز ہو کہ یہاں انہیں جان اور مال کی سلامتی کا گوشہ یا ان کی خوشحالیوں اور ترقیوں کا ذریعہ مل گیا۔ یہ امر بجائے خویش کچھ کم گراں قدر نہیں۔ دنیا میں امن و سلامتی کی ضمانت

اور بہبودیوں اور مرفہ الحالیوں کی کفالت ایک بہت بڑی نعمت ہے اور اس نعمت پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ لیکن طلوع اسلام کے نزدیک' پاکستان اس سے کہیں زیادہ عزیز تر ہے۔ اسلئے کہ اسکے تصورات کے مطابق، یہی وہ سرزمین ہے جہاں ہمیں یہ امکانی قوت حاصل ہے کہ ہم چاہیں تو اس قرآنی نظام کو پھر سے مشہود صورت میں سامنے لے آئیں جو نوع انسانی کی فلاح وسعادت کا موجب ہے اور جس کی عدم موجودگی سے انسانیت اس قدر ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ مصورِ پاکستان حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ نے جب ۱۹۳۰ء میں الہ آباد کے مقام پر پاکستان کا تصور پیش کیا تھا تو اس کا یہی مقصد بتایا تھا کہ اس سے مسلمان اس نہج کی زندگی بسر کرنے کا امکان حاصل کرلیں گے جو ان کے لئے ان کے خدا نے متعین کی اور جسے آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے ان کے رسول نے متشکل کرکے دکھا دیا۔ طلوع اسلام اسی پیغام حقیقت کشا کا نقیب اور اسی دعوتِ انسانیت ساز کا علمبردار ہے۔ اس لئے اس کے نزدیک پاکستان کی سرزمین عزیز ترین متاعِ حیات ہے کہ اسی خاک سے وہ اس شجرِ طیب کی نمود بالیدگی کی توقعات رکھتا ہے جس کے متعلق خالقِ فطرت نے کہا ہے کہ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ۔

پھر یہ حقیقت ہے کہ جو شے جس قدر زیادہ عزیز ہوتی ہے' اسی قدر اس کی حفاظت کی فکر زیادہ گہری ہوتی ہے۔ جس بوڑھے باپ کا ایک ہی بچہ ہو اور اس بچے کے ساتھ اس کی زندگی کی تمام آرزوئیں وابستہ، وہ اسے ایک لمحہ کے لئے بھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا۔ یوسف کی محبت دیدہ یعقوب ہی سے پوچھی جاسکتی ہے۔

لیکن وہ محبت' محبت نہیں، دشمنی ہے جس میں تربیت کو نظرانداز کر دیا جائے یا اپنے آپ کو غلط اطمینان سے فریب میں رکھا جائے اور اس طرح حقائق سے چشم پوشی کرلی جائے۔ جس بچے سے محبت ہوتی ہے اسے کسی وقت چھینک بھی آ جائے تو اس کا باپ فوراً کسی حکیم کی طرف رجوع کرتا ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ بچے کو تپ دق ہو رہی ہو اور وہ اس پر بھی یہ سننے کے لئے تیار نہ ہو کہ بچہ بیمار ہے۔ یہی تقاضائے محبت ہے جس نے آج تک طلوع اسلام کو پاکستان کی داخلی خرابیوں کی طرف سے چشم پوشی نہیں کرنے دی۔

کشتی کی خیریت

کشتی کا سوراخ صرف ملاحوں کا نقصان نہیں ہوا کرتا بلکہ کشتی کے مسافروں کا بھی جان لیوا ہوتا ہے۔ اس لئے جو مسافر کشتی میں سوراخ ہوتے دیکھ کر اس لئے خاموش رہے کہ اس سے میرا کیا بگڑتا ہے، کشتی خراب ہوتی ہے تو نقصان ملاحوں کا ہے' اس سے زیادہ نادان کوئی نہیں۔ اور جب صورت یہ ہو کہ وہی مسافر اور وہی ملاح ہوں تو پھر ایسے وقت میں اغماض اور خاموشی نادانی ہی نہیں' جرم بن جاتی ہے۔ طلوع اسلام اپنے اس فریضہ کا پوری طرح احساس رکھتا ہے اور یہی احساس ہے جو اسے اس پر مسلسل آمادہ رکھتا ہے۔ وہ پاکستان کی داخلی کمزوریوں کو تنقیدی نگاہ سے پرکھتا ہے تاکہ مرض کا علاج شروع ہی میں ہو جائے۔ آج کی صحبت میں بھی جو کچھ عرض کیا جائے گا، وہ اسی احساس کا نتیجہ اور اسی فریضہ کا مظاہرہ ہوگا۔

آپ کراچی سے خیبر اور کوئٹہ سے لاہور جہاں جی چاہے چلے جائیے (اور یہی حال مشرقی پاکستان کا ہے) سفر

میں، حضر میں، شہروں میں، بستیوں میں، جنگلوں میں، پہاڑوں میں، دفتروں میں، بازاروں میں، گھروں میں، محفلوں میں، خلوتوں میں، جلوتوں میں، ریلوں میں، لاریوں میں، سڑکوں میں، گلیوں میں کسی مقام پر جائیے، اور کسی سے بات کیجئے آپ

ہر شخص نالاں

کو بالعموم ہر شخص نالاں و گریاں دکھائی دے گا کہ پاکستان میں ظلم، ناانصافی، رشوت ستانی، بددیانتی، اعزہ پروری، اقربا نوازی، بداخلاقی، بے حیائی عام ہو گئی ہے۔ عدالتوں میں، دفتروں میں، بازاروں میں، غرضیکہ جہاں بھی انسان کو انسان سے واسطہ پڑتا ہے، کوئی معاملہ بھی اصول اور قانون کے ماتحت طے نہیں پاتا۔ بلکہ ذاتی مفاد پرستیوں اور شخصی مصلحت کوشیوں کے مطابق فیصلہ ہوتا ہے۔ بڑے سے لے کر چھوٹے تک ہر صاحب اختیار اپنے اختیارات کو ذاتی مفاد کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ رشوتوں کے چرچے کھلے بندوں ہوتے ہیں۔ مراعات کی خرید و فروخت علی الاعلان ہوتی ہے۔ اور جو چیزیں بازاروں میں علی الاعلان بکتی نہیں وہ اندھیری کوٹھڑیوں میں بلیک مارکیٹ کی سیاہ چادر کے نیچے فروخت ہوتی ہیں۔ دفاتری شعبوں میں حکامِ بالا ماتحتوں کی نالائقی اور کام چوری سے نالاں ہیں، اور ماتحت افسرانِ بالا کی حرام خوری اور اعزہ نوازی کے شاکی۔ محتسبین کے متعلق شکایت ہے کہ سوئی کی چوری پر کہرام مچا دیا جاتا ہے اور پہاڑ کے پہاڑ نہایت صفائی سے ہضم کرا دیئے جاتے ہیں۔ یہ باتیں ہر شخص کی زبان پر ہیں۔

اس میں شک اسی کو ہو سکتا ہے جو کبھی اپنے محلات کی خلوتوں سے باہر نکل کر عوام سے ملا جلا نہیں۔ یا اگر کبھی باہر آتا ہے تو ان سرکاری نمائندوں کے نرغے میں گھرا رہتا ہے جن کا منصب ہی یہ ہے کہ وہ نہ عوام کو ان کے قریب آنے دیں، نہ ان کی کوئی بات ان کے کان تک پہنچنے دیں اور ہر سوال کے جواب میں "ہر طرح خیریت ہے" کہہ کر ان کے حسنِ انتظام اور شائستگیٔ نظم و نسق کے قصیدے پڑھتے رہیں۔ سنا ہے کہ پچھلے زمانے میں بادشاہ راتوں کو بھیس بدل کر رعایا کے حالات معلوم کیا کرتے تھے اور یہ سنا کرتے تھے ۔۔ کہ کہتی ہے ان کو خلقِ خدا غائبانہ کیا ۔۔۔ ہمارا خیال ہے کہ ہر وہ صاحبِ اقتدار جسے ان حقائق کی صداقت میں جو اوپر گزارش کئے گئے ہیں، کچھ شبہ ہو، اس طرح سے بھیس بدل کر سنے کہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں، تو وہ خود اس کی شہادت دے گا کہ لوگوں کے احساسات اس سے بھی کہیں زیادہ شدید ہیں جو ہم نے بیان کئے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں میں سے عام طور پر ضابطے اور اصول کا احترام اٹھتا جا رہا ہے اور ان کے دلوں سے پاکستان کی حکومت کا اعتماد روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے۔ وہ عناصر جو شروع سے پاکستان کے مخالف چلے آ رہے تھے لیکن آج اپنی مصلحت کوشیوں کے تحت پاکستان کی کھلی کھلی مخالفت نہیں کر سکتے، وہ اس صورتِ حالات سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں اور لوگوں کے جذبات کو اور مشتعل کر رہے ہیں۔ اس سے کسی کے پیشِ نظر (خاکم بدہن) خود پاکستان کی تخریب ہے اور کسی کے سامنے حکومت کی کرسیوں پر خود متمکن ہونے کی آرزو۔ ایک مردِ مومن نے کہا تھا۔ کہ

سفینۂ برگِ گل بنا لیگا قافلہ مورِ ناتواں کا

اور دوسرے مردِ مومن نے اس نیک فال کو پورا کر کے دکھا دیا کہ

ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ طوفاں سے پار ہوگا!

لیکن آج کاروانِ مورِ ناتواں کی یہ نرم و نازک کشتی ہے اور ہزاروں "خضر صورت" جو خواہ اس میں سوراخ کرنے کے درپے۔

اس سے سلطنتیں تباہ ہو جاتی ہیں

اور جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، ان کی ان جرأتوں کا راز صرف اس میں ہے کہ یہاں وہ صورتِ حالات پیدا ہو گئی ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

اگر کسی کو فطرت کے اس اٹل قانون پر یقین نہ بھی ہو کہ دنیا میں کوئی نظام قائم نہیں رہ سکتا اگر اس میں ہر شے اپنے اصل مقام سے ہٹ چکی ہو، تو بھی کم از کم تاریخ کی شہادتیں ہی اس کو اس نتیجہ پر پہنچانے کے لئے کافی ہونی چاہئیں، کہ جو حالات ہمارے ہاں پیدا ہو چکے ہیں وہ بعینہٖ وہ نقشہ پیش کرتے ہیں جو سلطنتوں کے زوال کے وقت ہوا کرتا ہے۔ گبن کی "انحطاط سقوط رومۃ الکبریٰ" کی تاریخ اٹھائیے وہ اس عظیم الشان سلطنت کے زوال کے وقت اسی قسم کی صورتِ حالات بتاتا ہے۔ دور نہ جائیے۔ ابھی کل کی بات ہے سلطنتِ مغلیہ کو دیکھئے۔ اس کے آخری ایام میں ملک کی یہی حالت ہو چکی تھی۔ دنیا میں کمزور اور طاقتور سلطنتوں کے حالات کا موازنہ کیجئے، وہی سلطنتیں کمزور دکھائی دیں گی جن میں اس قسم کے حالات پیدا ہو چکے ہوں گے۔ بےشک سامان اور اسلحہ بڑی چیز ہے، لیکن جس ملک میں اخلاقی بنیادیں اس درجہ کھوکھلی ہو چکی ہوں، وہاں سازو سامان اور آلات و اسلحہ بھی بےکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہر قلبِ حساس کو خون کے آنسو رلا دینے کے لئے کافی ہے کہ تاریخ میں جو صورت سلطنتوں کے انجام کے وقت پیدا ہوتی تھی، ہمارے ہاں وہ صورت آغاز ہی میں پیدا ہو گئی۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ سوائے ان بدنہادوں کے جو پاکستان کی مخالفت کا چور دل میں لئے بیٹھے ہیں، کوئی پاکستانی بھی پاکستان کی تخریب کا خواہاں نہیں ہو سکتا۔ عوام نہیں ہو سکتے کہ انہیں سر چھپانے کے لئے کوئی اور جگہ نہیں، خواص نہیں ہو سکتے کہ ان کا موجودہ عروج پاکستان ہی کی بدولت ہے — ورنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے — لیکن اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ حالات بد سے بدتر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ہمارے ہاں اصلاح کا طریق یہ سمجھا گیا ہے کہ عوام اربابِ نظم و نسق کو کوستے رہتے ہیں اور اوپر کے طبقے والے عوام کی شکایات کرتے رہتے ہیں حالانکہ دونوں طبقے مل کر قوم بنتے ہیں اور جو حالات اس وقت پیدا ہو چکے ہیں وہ ساری قوم کے ہیں کسی ایک طبقہ کے نہیں۔

ساری قوم کی خرابی

اصل یہ ہے کہ ہندوستان میں ہماری یہ تمام قومی خرابیاں دبی ہوئی تھیں، اب انہیں ابھرنے کا موقع مل گیا ہے۔ پہلے فسادِ خون اندر تھا۔ اب وہ پھوڑے پھنسیاں بن کر جلد پر نمودار ہو گیا ہے۔ خون کا فساد کسی ایک حصہ جسم تک محدود نہیں ہوا کرتا، سارے جسم

میں یکساں طور پر موجود ہوتا ہے۔ ایک بات البتہ ضرور قابلِ لحاظ ہے۔ بڑے بوڑھے کہا کرتے تھے کہ ذمہ داریوں کا بوجھ خود بخود انسان کو راہِ راست پر لے آیا کرتا ہے۔ ذمہ داریوں کو اپنے سر لینے والوں سے اس قسم کی توقع بھی بے جا نہیں ہوا کرتی۔ ہمیں اس کا احساس ہے کہ چونکہ ہم میں سے کسی نے بھی اس سے پہلے حکومت نہیں کی تھی اس لئے ہمیں ابھی حکومت کے سلیقے نہیں آتے۔ لیکن اس سے زیادہ سے زیادہ نالائقی (INEFFICIENCY) کا ظہور ہونا چاہیئے۔ فقدانِ سیرت (CHARACTERLESS-NESS) کا نہیں۔ سیرت (CHARACTER) کی بہت سی خامیاں ضبط سے دور ہو جایا کرتی ہیں اور اگر انسان چاہے تو اپنے اندر ضبط پیدا کر سکتا ہے۔ ہمیں یہ توقع تھی کہ اربابِ نظم و نسق اپنی ذمہ داریوں کے احساس سے اپنے اندر ضبط پیدا کریں گے اور اس ضبط سے نظم و نسق کی وہ خرابیاں دور ہو جائیں گی جو عدمِ ضبط سے پیدا ہوا کرتی ہیں لیکن اس وقت تک کے شواہد اس پر دلالت کرتے ہیں کہ اربابِ نظم و نسق ضبطِ نفس پیدا نہیں کر سکے۔ اگر وہ ایسا کر لیتے تو ان کی مثال سے عوام بھی اپنے اندر نظم و ضبط (DISCIPLINE) پیدا کر لیتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن بڑی حد تک اربابِ حل و عقد کو قوموں کی تباہی اور کامیابی کا ذمہ دار قرار دیتا ہے۔

لیکن اس مشکل کا حل یہ بھی نہیں کہ فلاں گروہ اپنے اندر فلاں بات پیدا نہیں کر سکا تو اس کو مطعون کر دیا جائے۔ مسافروں کی ناعاقبت اندیشی سے یا ملاحوں کی خرابیِ فکر و نظر سے کشتی میں چھید ہو رہے ہیں۔ اور سوال صرف یہ ہے کہ یہ چھید کس طرح بند ہوں۔ اگر یہ چھید بند نہ ہوئے تو نہ مسافر ہی باقی بچیں گے نہ ملاح۔

کسی بلند ہستی کی نمود

اس قسم کے حالات میں ایک طریقِ کار یہ ہوا کرتا ہے کہ قوم میں کوئی ایک شخصیت ایسی پیدا ہو جائے جو پورے نظم و نسق کو اپنے ہاتھ میں لے لے اور اپنے فیصلوں کو بچوں کے استاد کی طرح ناقدانہ طور پر منوانی چلی جائے۔ ایسی شخصیت محض اپنی صلاحیت اور بلندیِ کردار کی بنا پر زمامِ اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لیتی ہے۔ اسے عوام کی سستی مقبولیت (CHEAP POPULARITY) کی قطعاً فکر نہیں ہوتی۔ وہ ایک مشفق جراح ہوتا ہے جو مریض کی چیخ و پکار کی پرواہ کئے بغیر لاعلاج حصوں کو کاٹ کر الگ کر دیتا ہے اور قابلِ اصلاح زخموں میں نشتر پیوست کئے چلا جاتا ہے۔ ترکی کی مثال شاہد ہے کہ ایسے گئے گزرے حالات میں جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے اس قسم کی شخصیت کا ابھر کر افقِ قوم پر نمودار ہو جانا قوم کی زندگی کا موجب ہو جاتا ہے۔ لیکن اس قسم کی شخصیت، قوم کی پیداوار نہیں ہوا کرتی۔ مصطفےٰ کمال، خلیفہ عبدالحمید اور خلیفہ عبدالمجید کی ترکی کی پیداوار نہ تھا۔ لہٰذا یہ بھی کوئی طریقِ علاج نہ ہوا۔ اس لئے کہ جو دوائی اپنے اختیار کی نہیں اس کا تریاق ہونا کس کام کا۔ اس کے لئے تو یہی کہہ کر خاموش ہو جانا پڑتا ہے کہ جس طرح ہنگامی طور پر پاکستان کی زمین مل گئی اسی طرح اتفاقی طور پر اسے سنبھالنے والا بھی پیدا ہو جائے گا۔

لہذا بات یہاں آکر ٹھہری کہ ان حالات میں اصلاح کی صورت کیا ہو؟ یہ حقیقت ہمارے سامنے آچکی ہے کہ ہمارا موجودہ اوپر کا طبقہ اپنے اندر غالباً کسی تبدیلی کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ یہ طبقہ بالعموم سن رسیدہ ہے اور اس عمر میں اس قالب کا توڑنا بڑی ہمت کا کام ہوا کرتا ہے جس میں انسان کی عادات و اطوار ڈھل چکی ہوں۔ لہذا ان سے کسی تبدیلی کی توقع کرنا بیکار رہے۔ نہ ہی یہ تدبیر کچھ مفید مطلب ہو سکتی ہے کہ ان کی جگہ دوسرے آدمی لائے جائیں۔ اسلئے کہ وہ بھی انہیں قالبوں میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ آپ نے سندھ میں وزارتوں کی تبدیلیوں اور پنجاب میں اس کے تعطل کو بھی آزما دیکھا۔ قوم ساری ایک جیسی ہے اور کسی طبقہ کا یہ دعویٰ کہ اسے دوسرے گروہ پر کوئی افضلیت حاصل ہے، محض انتخابی مہم کی تکنیک ہے خواہ اس پر شریعت کے لیبل لگائے جائیں یا سرمایہ داری کی مخالفت کے۔ صورتوں کی تبدیلی سے سیرتیں نہیں بدل جایا کرتیں۔ اگر آج قوم میں کوئی ایسا گروہ موجود ہے جسے اپنی بلندیٔ سیرت کا دعوےٰ ہو تو وہ انتخابی راستوں سے ہی اصلاح نہیں کر سکتا۔ سیرت کی بلندی تو جس مقام پر بھی ہو اپنا اثر پیدا کر دیتی ہے۔ چندن، قصرِ کسریٰ اور فقیر کی جھونپڑی میں یکساں طور پر خوشبو پھیلاتا ہے۔

ہمارے نزدیک اصلاح کی وہی صورت ہے جو قرآن نے داستانِ بنی اسرائیل میں نہایت حسین انداز میں بیان فرمائی۔ بنی اسرائیل کی وہی حالت ہو چکی تھی جو آج ہماری ہے۔ مدتوں کی غلامی نے انکے تمام درخشندہ جوہر سلب کر لئے تھے اور افسردگی اور دنائت کی تمام خرابیاں ان میں پیدا ہو چکی تھیں۔ صاحبِ ضربِ کلیمؑ کے یدِبیضا کی چمک انہیں فرعون کی غلامی سے نکال کر ایک آزاد خطۂ زمین میں لے آئی تھی۔ لیکن خطۂ زمین کے بدل جانے سے ان کی سیرتوں میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو سکی۔ ایک چھوڑ تین تین پیغمبر ان کے اندر موجود تھے۔ حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ، اور طور کی وادیوں میں حضرت شعیبؑ۔ لیکن وہ قوم جہاں تھی وہیں رہی۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ سے کہہ دیا گیا کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو۔ صرف اتنا انتظام کر دو کہ کوئی بیرونی خطرہ اس سرزمین کی تخریب کا باعث نہ ہو جائے۔ اس دوران میں قوم کی نئی نسلوں کو اپنے ہاتھ میں لو۔ ان کی تربیت اپنے انداز سے کرو۔ چنانچہ ہوا یہ کہ ادھر مرورِ زمانہ سے یہ بوسیدہ ہڈیاں رفتہ رفتہ ختم ہوتی گئیں اور اتنے میں وہ نوجوان تیار ہو گئے جنہیں خاص انداز میں پروان چڑھایا گیا تھا۔ یہ شاہین بچے اُبھرے اور ایک ہی جھپٹ میں اس ارضِ موعود پر قابض ہو گئے جن میں ان کے بڑے بوڑھوں کو بڑے دیو نظر آیا کرتے تھے۔ لہذا پاکستان والوں کے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ اپنی آنے والی

آنے والی نسلوں کی صحیح تعلیم

نسل کی صحیح تعلیم کا انتظام کریں کہ تعلیم ہی وہ قالب تیار کرتی ہے جس میں سیرتیں ڈھلا کرتی ہیں۔ آج اس بات پر نہ روئیے کہ موجودہ اوپر کا طبقہ سیرت و صلاحیت کے اعتبار سے کتنا پست ہے، نہ ہی اس پر کہ نیچے کا طبقہ ضبط و انضباط کی رُو سے کس قدر خام ہے۔ روئیے اس بات پر کہ قوم کی آنے والی نسل کی صحیح تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہیں۔ حکومت کے نظم و نسق

کے ہر دوسرے گوشے کی خامیوں کو برداشت کر لیا جا سکتا ہے لیکن آنے والی نسل کی صحیح تعلیم و تربیت سے متعلق گوشے کی خامیوں کو کسی صورت میں بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے کہ اگر وہ نسل بھی ہماری موجودہ نسل کے نقشِ قدم پر چلتی رہی تو پھر یہ سرزمین ہماری ہزار آرزوؤں کے باوجود کبھی محفوظ نہیں رہ سکے گی۔ ہم لوگوں سے یہ شکایت بھی سنتے ہیں کہ ہماری حکومت تعلیم کی طرف پوری توجہ نہیں دے رہی۔ لیکن ان کی شکایت کا مطلب صرف اس قدر ہوتا ہے کہ حکومت نے کافی تعداد میں اسکول نہیں کھولے یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ سکولوں میں پڑھائی اچھی نہیں۔ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں، وہ یہ نہیں کہ آپ قریہ قریہ میں اسکول کھول دیجئے اور ہر اسکول کا نتیجہ سو فی صدی دکھا دیجئے۔ اگر ایسا کر دیا جائے تو بھی ہمارے نزدیک یہ صحیح تعلیم نہیں کہلا سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں ابھی تک خواندگی (LITERACY) اور تعلیم (EDUCATION) میں فرق ہی نہیں کیا جاتا۔ ہمارے ہاں خواندگی ہی کو تعلیم سمجھا جاتا ہے۔ تعلیم کے لئے خواندگی ضروری ہے لیکن خواندگی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ زندگی ہمیشہ اقدار (VALUES) کے تابع چلتی ہے۔ اقدار ہی اس کا نصب العین متعین کرتی ہیں جس قسم کی اقدار انسان کے سامنے ہونگی، اسی قسم کی اس کی زندگی ہوگی، اور جس قدر ان اقدار سے کسی کو عشق ہوگا اسی قدر سعی و کاوش اور جذبِ انہماک سے ان کے حصول اور تحفظ کے لئے انسان سرگرمِ عمل رہے گا۔ تعلیم زندگی کی اقدار متعین کرتی ہے۔ جس قسم کی تعلیم ہوگی اسی قسم کی اقدار متعین ہو جائیں گی۔ صحیح تعلیم سے مفہوم یہ ہے کہ نوجوانوں کے سامنے زندگی کی صحیح اقدار لائی جائیں۔ رسولِ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق جب فرمایا کہ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَۃَ۔ (کہ وہ انہیں نظامِ زندگی اور محکماتِ حیات کی تعلیم دیتا ہے)، تو اس سے مراد نوشت و خواند کی تعلیم نہ تھی بلکہ وہی تعلیم تھی جو انسان کے سامنے زندگی کی صحیح اقدار متعین کرتی ہے اور جس کا نتیجہ انسان کی فطری صلاحیتوں کی بالیدگی (ربوبیتِ خویش) ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرہ میں آج جو جو خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے سامنے زندگی کی صحیح اقدار نہیں۔ ہمارے معاشرہ میں زندگی کی سب سے بڑی قدر، انفرادی خوشحالی اور حصولِ اقتدار ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم لیٹروں کا گروہ یا حیوانوں کا گلہ بن چکے ہیں۔ قرآن کا سب سے بڑا اعجاز یہ ہے کہ وہ زندگی کی صحیح اقدار سامنے لے آتا ہے اور یہی اقدار سیرت کی بنیادیں بن جاتی ہیں چونکہ قرآن وہ اقدار متعین کرتا ہے جس سے انسانیت کی پوری پوری نشو و نما ہو جاتی ہے۔ اس لئے جس کسی کی سیرت ان اقدار کی بنیادوں پر متشکل ہوتی ہے، اس کی نظیر کہیں اور نہیں مل سکتی۔ یہ ظاہر ہے کہ رقبہ اور صنعت و حرفت کے اعتبار سے پاکستان دنیا کے بہت سے خطوں سے پیچھے ہے اور جس رفتار سے دنیا ترقی کر رہی ہے اس کے پیشِ نظر ہم مغربی اقوام کے ہم پلہ کبھی نہیں ہو سکیں گے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے بلکہ ان سے آگے نکل جانے کے لئے ہمارے پاس ایک دوسرا میدان ہے، اور وہ میدان ہے ان اقدار کا جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ یہ اقدار کسی اور فلسفۂ زندگی میں نہیں مل سکتیں۔ اس لئے جو کیرکٹر ان اقدار کے قالب میں ڈھلے گا اس کی قوت کا جواب دنیا میں اور کہیں

نہیں مل سکیگا۔ یہی ہے وہ میدان جس میں نہ صرف یہ کہ ہم اپنی موجودہ خامیوں کو ہی رفع کر سکیں گے بلکہ مغرب کی ترقی یافتہ اقوام سے بھی آگے بڑھ جائینگے۔

قانونِ شریعت کا سلوگن

تقسیم کے بعد قوم کو "قانونِ شریعت کو نافذ کرو" کا سلوگن دیا گیا۔ عوام کے تقلیدی ذہن نے اسے بڑا خوش آئند سمجھا اور یہ سلوگن بڑا مقبول ہو گیا۔ اس سلوگن کے پیچھے جو جذبہ محرکہ تھا وہ انتخابات کے قریب آنے سے بے نقاب ہوتا چلا گیا۔ لیکن اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو بھی یہ حقیقت تو طلب تھی کہ قانونِ شریعت سے مراد کیا ہے اور اس کے نفاذ سے حاصل کیا ہو گا؟ اس چیز کو آج تک کسی نے متعین کر کے نہیں بتایا۔ اس لئے کہ اس سلوگن کو پیش کرنے والے اس کاروباری راز (TRADE SECRET) کو عام نہیں کرنا چاہتے۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ پہلے ہمیں برسرِ اقتدار کر دو پھر ہم بتائیں گے کہ قانونِ شریعت کیا ہوتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ قانونِ شریعت سے مراد وہ تعزیری سزائیں ہو سکتی ہیں جو بعض جرائم کی پاداش میں نافذ کی جا سکتی ہیں، یا نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ سے متعلق مسائل۔ ذرا غور کیجئے کہ اگر اس قانون کو نافذ بھی کر دیا جائے تو اس سے کون سی اصلاح کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ آج بھی تو (چند مستثنیات کے سوا) وہ تمام کام جرائم شمار کئے جاتے ہیں جنہیں ہماری شریعت جرائم قرار دیتی ہے اور ان جرائم کی سزائیں بھی مقرر ہیں۔ ان سزاؤں کی نوعیت میں کچھ فرق سہی لیکن بہرحال سزائیں تو موجود ہیں۔ ان سزاؤں کی موجودگی سے اصلاحِ حال کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو رہی۔ اسلئے اگر ان کی جگہ شرعی سزائیں نافذ کر دی جائیں تو پھر کونسی تبدیلی پیدا ہو جائے گی۔ بالآخر ایسے ممالک بھی تو ہیں جہاں اس قسم کا قانونِ شریعت نافذ ہے۔ وہاں کے معاشرتی حالات ہم سے کسی صورت میں بہتر نہیں۔ قرآن ایک نظامِ زندگی متعین کرتا ہے۔ اور یہ نظام متشکل نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ قوم کے دل و دماغ کی تعمیر ان خطوط پر نہ ہو جو اس نظام کے قیام اور بقا کے ذمہ دار بن سکتے ہیں اور یہ خطوط تعلیم ہی کے ذریعے نمایاں ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اصل مطالبہ صحیح قرآنی تعلیم کے اجراء کا ہونا چاہیئے۔ پھر یہ رکھیئے کہ قرآنی تعلیم سے مفہوم فنِ تجوید یا قرآن کی تفاسیر پڑھانا نہیں۔ اس تعلیم سے مراد یہ ہے کہ قوم کے نوجوانوں کے سامنے وہ اقدار لائی جائیں جو قرآن متعین کرتا ہے۔ تاریخی شواہد اور آفاقی حوادث کی روشنی میں یہ بتایا جائے کہ یہ اقدار کس طرح انسانیت کی نشو و ارتقاء کا موجب بن سکتی ہیں۔ اور اس سے مختلف اقدار کیوں ایسے نتائج پیدا نہیں کر سکتیں۔ اگر ہم نے اس قسم کی تعلیم کا انتظام کر لیا تو نہ صرف یہ کہ پاکستان کا خطہ ہی محفوظ رہ جائے گا بلکہ ہو سکتا ہے کہ نوعِ انسانی کی امامت اسی خطہ کے بسنے والوں کو نصیب ہو جائے۔

قرآنی تعلیم

اگر قوم صحیح معنوں میں موجودہ صورتِ حالات میں تبدیلی کی خواہاں ہے تو اس کے لئے کرنے کا کام ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ اربابِ نظم و نسق کو اس بات پر مجبور کر دیا جائے کہ

وہ ملک میں صحیح قرآنی تعلیم نافذ کریں جس سے صحیح اسلامی نظام قائم ہو سکے۔ قوم نے تیس سال بے معنی کوششوں میں ضائع کر دیئے۔ اگر ہم آج بھی اپنی کوششوں کو اس ایک نقطہ پر مرکوز کریں تو بھی ہماری بگڑی کو بنتے کچھ دیر نہیں لگے گی۔ اگر قوم اس ضرورت سے متفق ہے کہ وہ حکومت سے صحیح تعلیم کا مطالبہ کرے اور اگر حکومت اس ضرورت کا احساس رکھتی ہے لیکن اسے یہ معلوم نہیں کہ یہ کام کس طرح کیا جائے تو اس باب میں ہم ہر طرح کی معاونت کے لئے تیار ہیں۔ سب سے پہلا کام مرکز میں ایک ایسی مجلس (کمیٹی) کا تعین ہے جو اس مسئلہ کی جانچ پڑتال کرے، اور اس کے بعد ملک کے لئے ایک مکمل نصاب تعلیم تجویز کرے۔ اگر حکومت کو ضرورت ہو تو ہم یہ بھی بتا سکیں گے کہ ہمارے خیال کے مطابق اس اہم کام کے لئے کون کون سے لوگ موزوں ہیں۔

لیکن اگر قوم نے اس بنیادی ضرورت کا احساس نہ کیا اور ارباب حکومت نے اپنے پیش نظر صرف یہی رکھا کہ عوام کو کس طرح سے خوش فہمیوں میں مبتلا رکھا جا سکتا ہے تو پھر زیادہ سے زیادہ ہوگا یہ کہ ایک طرف سرکاری مدارس سے کلرک پیدا ہوتے رہیں گے جو صرف روٹی کمانے کے لئے مشینوں کی جگہ کام میں لگائے جائیں گے اور دوسری طرف مذہبی تعلیم کے دارالعلوم کھلیں گے جن میں وہ لوگ پیدا ہوں گے جنہیں روٹی کمانے کا سلیقہ بھی نہیں آئیگا۔ اور پاکستان کی حالت یہ ہوگی کہ دنیا کے دوسرے "اسلامی ممالک" کی طرح اقوام مغرب کے رحم و کرم پر دنیا کے نقشے پر موجود رہیگا اور جب ان کی سیاسی مصلحتوں کا تقاضا ہوگا تو اس نقشہ سے اس کا نام بھی مٹا دیا جائیگا۔

"یٰلیتنی مت قبل ھذا۔ وکنت نسیًا منسیًا"

(باقی)

اعلان

خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا کریں۔ نیز پرچہ ہر ماہ کی یکم تاریخ کو حوالہ ڈاک کر دیا جاتا ہے۔ اگر ۱۰ تاریخ تک آپکو پرچہ نہ ملے تو ۱۵ تاریخ تک اسکی اطلاع دفتر میں بھیج دیا کریں۔

ضرورت رشتہ

تین نیک سیرت دوشیزگان جن کی تعلیم بالترتیب ایم۔ اے (اردو)، بی۔ ایس۔ سی، اور ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی ہے، کے لئے شریف اور برسرروزگار نیک سیرت نوجوانوں کے رشتے مطلوب ہیں۔ ذات پات کی کوئی پابندی نہیں۔ خط و کتابت درج ذیل پتہ پر کیجائے۔

ش۔م۔ معرفت ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲۔ لاہور

اپنی بہنوں کے نام

اثر کرے نہ کرے سُن تو لے مری فریاد

میری عزیز بہنو! ۔ سلامِ مسنون!

میں اس خطاب کا آغاز اُس روایتی آہ و فغاں اور وراثتی شکوہ و شکایت سے نہیں کرنا چاہتی کہ مردوں نے ہمارے حقوق کو غصب کر رکھا ہے۔ انہوں نے ہمیں اپنے پنجۂ استبداد میں جکڑ رکھا ہے۔ وہ زندگی کے کسی گوشے میں بھی ہمیں اپنے ہمدوش چلنے نہیں دیتے۔ انہوں نے ہمیں اپنا دست نگر، لہٰذا اپاہج اور مفلوج بنا چھوڑا ہے۔ میں یہ حکایتیں اور شکایتیں لے کر آپ کے سامنے نہیں آئی۔ میں تو آپ سے صرف اتنا پوچھنے کے لئے حاضر ہوئی ہوں کہ جو حقوق ہمیں حاصل ہیں، ہم نے ان سے کس قدر فائدہ اٹھایا ہے اور انہیں کس حد تک استعمال کیا ہے؟ یہ دور آئینی حکومتوں کا ہے اور آئینی حکومتوں میں حقوق کا تحفظ قانون کی رُو سے ہوتا ہے۔ یہ قوانین، قانون ساز اسمبلیوں میں مدون ہوتے ہیں۔ یہ اسمبلیاں مشتمل ہوتی ہیں ان ارکان پر جنہیں قوم منتخب کرتی ہے۔ پاکستان میں پہلے ۱۹۵۶ء کا آئین نافذ ہوا، اور اس کے بعد ۱۹۶۲ء کا۔ ان میں کہیں یہ نہیں کہا گیا تھا کہ قانون ساز اسمبلیوں کے ارکان صرف مرد ہوں گے، عورتیں نہیں ہوں گی۔ ان دساتیر کی رُو سے، عورتوں کو ووٹ دینے کا حق بھی ایسا ہی حاصل تھا جیسا مردوں کو، اور اسمبلیوں کی نشستوں کے لئے عورتیں بھی اسی طرح انتخاب لڑ سکتی تھیں جس طرح مرد۔ ملک میں عورتوں کی آبادی کم و بیش نصف کے برابر ہے۔ اس لحاظ سے، ان اسمبلیوں میں زیادہ نہیں تو آدھی نشستیں عورتیں حاصل کر سکتی تھیں۔ ملک میں ایسی خواتین کی کمی نہیں جو قابلیت اور صلاحیت کے اعتبار سے مردوں سے پیچھے ہوں۔ اس کے باوجود سوچئے کہ ملک میں کتنی عورتیں تھیں جنہوں نے اپنے اس حق کا استعمال کیا اور اسمبلیوں کی نشستوں کے لئے انتخاب لڑا؟ اس کے برعکس کتنے مرد امیدوار تھے جنہیں ہم نے اپنے ووٹوں سے کامیاب کرایا اور وہ مجالسِ قانون ساز کے ممبر بن گئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے (آپ کے ووٹوں کے صدقے ممبر بن کر) کیا کیا؟ انہوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ جن عائلی قوانین کی رُو سے آپ کو کچھ تھوڑے بہت حقوق حاصل ہوئے تھے انہیں منسوخ کرا

دیا جائے۔ وہ تو یوں کہئے کہ ملکی سیاست کے بحران کی وجہ سے ان حضرات کو اپنی سی پڑ گئی اور انہیں ان امور کیطرف توجہ دینے کی فرصت نہ مل سکی، ورنہ اس سے بہت پہلے عائلی قوانین کا جنازہ نکل چکا ہوتا۔ ناواقف لوگ سمجھتے ہوں گے کہ معلوم ان قوانین کی رُو سے عورتوں کو کس قدر اختیارات دے دیئے گئے تھے جو مرد اس قدر خوف زدہ اور بدحواس ہو گئے اور انہوں نے اپنی عافیت اسی میں سمجھی کہ انہیں کسی نہ کسی طرح منسوخ کرا دیا جائے۔ سنئیے کہ ان قوانین کی رُو سے طبقۂ نسواں کو کیا "خصوصی حقوق اور امتیازی اختیارات" دیئے گئے تھے۔ ان قوانین میں کہا گیا تھا کہ

(۱) نکاح کے وقت طے شدہ شرائط، نکاح نامہ میں درج کی جائیں اور یہ نکاح نامہ رجسٹرار نکاح کے دفتر میں رجسٹر کرا لیا جائے تاکہ بعد میں کوئی جھگڑا کھڑا نہ ہو۔

(۲) نکاح بالغ لڑکے اور بالغ لڑکی کا کیا جائے۔

(۳) نکاح نامہ میں عورت اپنے اس حق کو محفوظ کر لے کہ اگر خاوند ظلم اور تشدد پر اتر آئے تو وہ طلاق حاصل کر کے اس سے گلو خلاصی کرا سکے گی۔

(۴) میاں بیوی میں کشیدگی ہو جائے تو ثالثی کونسل کوشش کرے کہ ان میں باہمی مصالحت کی صورت پیدا ہو جائے۔ اگر ان کی یہ کوشش کامیاب نہ ہو تو پھر نکاح فسخ ہو جائے۔

(۵) میاں صاحب اگر دوسری بیوی لانا چاہیں، تو اس کے لئے پہلی بیوی کی رضامندی ضروری ہوگی۔

یہ تھے وہ "خصوصی حقوق" جو عائلی قوانین کی رُو سے عورتوں کو دیئے گئے تھے اور جن کے خلاف مردوں کی طرف سے قیامت برپا کر دی گئی تھی۔ اس وقت تو یہ قوانین کسی نہ کسی طرح بچ نکلے تھے لیکن اب یہ کہا جا رہا ہے کہ نئی اسمبلیوں میں سب سے پہلا وار انہی قوانین پر کیا جائے گا اور انہیں منسوخ کرا دیا جائے گا۔

میں اپنی ان بہنوں سے جنہیں فطرت نے دلِ بیدار اور چشمِ بینا عطا کی ہے، عرض کرنا چاہتی ہوں کہ وہ غور کریں کہ اس سے پوزیشن کیا سامنے آتی ہے؛ یہ کہ ہم خود اپنے ووٹوں سے، ان نشستوں کے لئے جو ہمارے قبضے میں آ سکتی ہیں، ان مردوں کو ممبر منتخب کراتی ہیں جو ہمارے ہی گلے پر چھری چلاتے ہیں۔ اگر ہم خود پارلیمان میں چلے جائیں تو کم از کم اپنے حقوق کی نگہداشت تو کر سکیں۔ لہٰذا، اس وقت کرنے کا کام یہ ہے کہ آئندہ الیکشن میں، موزوں خواتین صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کی نشستوں کے لئے خود انتخاب لڑیں اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں وہاں پہنچیں۔

اس سلسلہ میں ایک اور دلچسپ چیز بھی ہمارے سامنے آتی ہے۔ آئین کی رُو سے، اسمبلی میں آٹھ دس نشستیں عورتوں کے لئے مخصوص کر دی جاتی ہیں۔ ان نشستوں کے متعلق عام تاثر یہ ہوتا ہے کہ اس امتیاز خصوصی سے عورتوں کی زبوں حالی پر رحم کیا گیا ہے جس کے لئے انہیں مردوں کا شکر گزار ہونا چاہیئے، حالانکہ غور سے دیکھا جائے تو اس رعایت کی حیثیت بھیک کے ٹکڑوں کی سی ہے جنہیں کسی محتاج گداگر کی جھولی میں ڈال دیا جائے ــــ اور معلوم ہے

کہ بھیک کے ان ٹکڑوں کی قیمت کیا وصول کی جاتی ہے۔ یہ کہ ان نشستوں کے لئے عورتوں کا انتخاب مرد اراکین کرینگے۔

میں اپنی بہنوں سے عرض کرونگی کہ اس قسم کی "رعایت" عورت کے لئے وجہ ہزار تذلیل ہے۔ عورتوں کی درحقیقت انتہائی کوشش یہ رہی ہے اور آج تک ہے کہ عورت کے دل میں یہ تاثر راسخ کر دیا جائے کہ وہ زندگی کے ہر شعبے میں مرد کی رہین منت ہے اور ایسی کمزور و نحیف ہے کہ مرد کے سہارے کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتی۔

میں اپنی بہنوں سے گزارش کرونگی کہ وہ اس رعایت خصوصی کو بہ تشکر واپس کر دیں اور تمام نشستوں کے لئے امیدوار ہو کر خود الیکشن لڑیں اور یوں اپنے حقوق کا تحفظ آپ کریں۔

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو

اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

(۵)

مذہب پرست طبقہ عائلی قوانین کی شدت سے مخالفت کر چکا ہے۔ اس لئے اسے اب عورتوں سے ووٹ طلبی کے سلسلہ میں کچھ جھجک سی محسوس ہو رہی ہے۔ وہ اس جھجک کو مٹانے کے لئے یہ حربہ اختیار کر رہا ہے کہ وہ عورتوں سے کہتا ہے کہ عائلی قوانین تو تہذیب مغرب کی نقالی تھی۔ ہم تمہیں وہ حقوق دلائینگے جو مسلمان عورت کو خدا اور رسول نے عطا کئے ہیں۔ اور وہ حقوق، ان حقوق سے کہیں بلند اور بہتر ہیں جو تقلیدِ مغرب میں تمہیں دیئے گئے تھے۔ وہ اس قسم کے مقدس الفاظ استعمال کرینگے لیکن کبھی واضح طور پر نہیں بتائینگے کہ وہ حقوق ہیں کیا جنہیں وہ از روئے شریعت عورتوں کو دلائینگے؟ اس سلسلہ میں میں گزارش کرونگی کہ آپ ان لوگوں سے حسب ذیل سوالات پوچھئے اور ان سے کہیئے کہ وہ ان کا متعین طور پر جواب تحریر میں دیں۔

(۱) کیا آپ اسے جائز سمجھتے ہیں کہ ایک نابالغ لڑکی کی شادی ایک نوجوان لڑکے سے کر دی جائے اور وہ اس لڑکی سے جنسی اختلاط بھی کرے؟

(۲) کیا آپ مرد کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ جب جی چاہے اپنی بیوی کو طلاق۔ طلاق۔ طلاق کہہ کر الگ کر دے۔ اور اسکے بعد اگر وہ اپنے کئے پر نادم ہو اور بیوی کو دوبارہ نکاح میں لانا چاہے تو وہ اس کے نکاح میں نہ آ سکے جب تک وہ کسی اور مرد سے نکاح کر کے شب باشی کے بعد، اس سے طلاق حاصل نہ کر لے (یعنی اس طرح طلاق دینے کی حماقت تو مرد کرے اور اس کی اس قدر شرمناک سزا عورت بھگتے کہ وہ ایک شب کسی غیر مرد کے آغوش میں بسر کرے (اسے حلالہ کہتے ہیں)۔

(۳) کیا آپ عورت کو بھی اس کا حق دیتے ہیں کہ وہ جب مرد کے نکاح میں نہ رہنا چاہے عقدِ نکاح کو اسی طرح ختم کر دے جس طرح مرد ختم کر سکتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، کیا آپ عورت کو بھی اسی طرح حق طلاق دیتے ہیں جس طرح مرد کو

حق حاصل ہے۔

(۴) کیا آپ مرد کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ جب جی چاہے، بیک وقت چار تک بیویوں سے شادی کرلے۔

(۵) کیا آپ مرد کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ عند الضرورت بیوی کو مار پیٹ بھی سکتا ہے؟

آپ یہ سوالات ان حضرات سے پوچھئے اور ان کا متعین جواب تحریری طور پر لیجئے۔ آپ کو خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ وہ کون سے حقوق ہیں جو یہ حضرات آپ کو دیں گے! آپ ان کے اس قسم کے دعووں میں مت آجائیے کہ اسلام عورت کو بڑے وسیع حقوق دیتا ہے اور ہم آپ کو اسلامی حقوق دلائیں گے ___ یہ سب الیکشن کے حربے ہیں۔ جو سادہ لوح بہنیں انہیں حقیقت سمجھتی ہیں، میں ان سے اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتی ہوں کہ

اس فریبِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ! اے ناداں! قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

(۰)

بہنو! میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ:۔

(۱) جو بہنیں صلاحیت، ہمت اور استطاعت رکھتی ہوں وہ صوبائی اور مرکزی پارلیمان کی نشستوں کے لئے الیکشن لڑیں۔ یاد رکھئے۔ مذہب پرست طبقہ اس پر قطعاً اعتراض نہیں کرسکتا۔ جب وہ محترمہ فاطمہ جناح (مرحومہ) کے منصبِ صدارت کے لئے الیکشن لڑنے کو از روئے شریعت جائز سمجھتا تھا تو کسی عام نشست کے لئے عورت کا بطور امیدوار کھڑے ہونا کس طرح خلافِ شریعت قرار پا سکتا ہے۔

(۲) مخصوص نشستوں کے لئے اپنے آپ کو بطور امیدوار پیش نہ کریں۔ یہ گداگری ہے اور وجہِ تذلیلِ نسائیت۔

(۳) ووٹ دینا ہو، تو صرف اس امیدوار کو ووٹ دیجئے جو یہ تحریر دے کہ میں عائلی قوانین کی تائید کروں گا اور انہیں برقرار رکھنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔

سر دست کم از کم اتنا تو کیجئے۔ یاد رکھئے۔ موجودہ معاشرہ میں جو اپنے حقوق کا تحفظ آپ نہیں کرتا، اس کی حفاظت کوئی نہیں کرتا۔ وہ روندا جاتا ہے، کچلا جاتا ہے۔

والسلام!

دردمند دلوں کی دھڑکن

"نفیرہ"

طلوعِ اسلام
میں اشتہار دے کر اپنی تجارت کو فروغ دیجئے۔
آج ہی ایک کارڈ لکھ کر نرخ نامہ اشتہارات طلب فرمائیں!

شاہد نقادی

"مودودی صاحب کا انتقامی اسلام"

طلوعِ اسلام نے اپنی جولائی ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں مودودی صاحب کا جو نفسیاتی "تجزیہ" پیش کیا ہے اس سے بہت سے حقائق پر پڑے ہوئے پردے اُٹھ گئے ہیں اور فکر کی نئی راہیں روشن ہو گئی ہیں۔ مودودی صاحب کی شخصیت سمٹ کر ایک لفظ کے اندر آجاتی ہے اور وہ لفظ ہے "انانیت"۔ جب انانیت کو شکست ہوتی ہے تو اس سے انتقام کا جذبہ اُبھرتا ہے اور چونکہ مودودی صاحب نے مذہب کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے اسلئے اُن کا اسلام اس جذبہ کے تحت بدلتا رہتا ہے۔ جو اُن کا ہمنوا ہے اُس کا کفر بھی اسلام ہے اور جس سے وہ انتقام لینا چاہتے ہیں اُس کا اسلام بھی کفر ہے اگرچہ اس کی مثالیں ان کی ساری زندگی پر پھیلی ہوئی ہیں لیکن بہ غرضِ اختصار ہم گزشتہ دس سالہ دور سے چند ایک مثالیں پیش کرینگے۔ یا یوں کہیے کہ چونکہ انہیں سب سے بڑی زد صدر ایوب کے زمانے میں پہنچی اس لئے اس دور میں اُن کے اس انتقامی اسلام کے نمونے زیادہ شدت سے اُبھر کر سامنے آگئے۔

۱۔ صدارتی نظام

پارلیمانی نظام میں صدرِ مملکت کو ویٹو کا حق نہیں ہوتا۔ صدارتی نظامِ حکومت میں اُسے یہ حق حاصل ہوتا ہے۔ جس زمانے میں مودودی صاحب کے سامنے یہ سوال آیا کہ اسلام کی رُو سے امیرِ مملکت کو ویٹو کا حق حاصل ہو سکتا ہے یا نہیں تو انہوں نے لکھا۔

> جب امیر کو چُن لیا جائے گا تو اس کو سیاہ و سفید کے اختیارات ہوں گے۔ امیر کو مشورہ کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ عموماً مجلس کے فیصلے کثرتِ رائے سے ہونگے مگر اسلام تعداد کی کثرت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ ایک اکیلے شخص کی رائے پوری مجلس کے مقابلے میں برحق ہو۔ اور ایسا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ حق کو اس لئے چھوڑ دیا جائے کہ اُس کی تائید میں ایک جمِ غفیر نہیں ہے۔ لہٰذا امیر کو حق ہے کہ اکثریت کے ساتھ اتفاق کرے یا

اقلیت کے ساتھ امیر کو یہی حق حاصل ہے کہ پوری مجلس سے اختلاف کر کے اپنی رائے پر فیصلہ کرے۔

(اسلام کا سیاسی نظریہ۔ صفحہ ۴۴-۴۵)

اس سے بھی واضح تر الفاظ میں انہوں نے ترجمان القرآن کی جون ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں لکھا تھا کہ

امیر مملکت شوریٰ کی اکثریت کے مقابلہ میں ویٹو کا استعمال کر سکیگا۔ (صفحہ ۱۴۳)

جماعت اسلامی نے پاکستان کے آئین کے سلسلے میں جو دستوری خاکہ مرتب کیا تھا اس کی دفعہ ۳۶ میں کہا گیا تھا کہ

امیر کو مجلس شوریٰ کی اکثریت کے مقابلہ میں ویٹو کا حق حاصل ہو گا۔

(دو دستوری خاکے صفحہ ۲۸)

اس کے بعد صدر ایوب برسراقتدار آگئے اور انہوں نے صدارتی نظام نافذ کر دیا۔ مودودی صاحب نے اس کی سخت مخالفت کی اور ترجمان القرآن بابت مارچ ۱۹۶۵ء میں سورۃ الشوریٰ کی آیت وامرھم شوریٰ بینھم کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا کہ اس سے اسلام کا یہ فیصلہ سامنے آجاتا ہے کہ

جو مشورہ اہل شوریٰ کے اجماع (اتفاق رائے) سے لیا جائے یا جسے ان کے جمہور (اکثریت) کی تائید حاصل ہو اُسے تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ اگر ایک شخص یا ایک ٹولہ سب کی سننے کے بعد اپنی من مانی کرنے کا مختار ہو تو مشاورت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرما رہا کہ "ان کے معاملات میں اُن سے مشورہ لیا جاتا ہے" بلکہ یہ فرما رہا ہے کہ "اُن کے معاملات آپس کے مشورے سے چلتے ہیں" اس ارشاد کی تعمیل محض مشورہ دے دینے سے نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ مشاورت میں اجماع یا اکثریت کے ساتھ جو بات طے ہو اُسی کے مطابق معاملات چلیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم کی ایک ہی آیت کی تفسیر صدر ایوب کے دور حکومت سے پہلے کیا کی گئی تھی اور اس کے بعد جو تفسیر کی گئی وہ کس طرح پہلی تفسیر کی بالکل ضد تھی۔ کیونکہ اب سامنے صدر ایوب تھا۔

۲۔ عورت کی سربراہی

ایک اور مثال لیجئے۔ جب شروع شروع میں پاکستان کی مجلس دستور ساز میں آئین کا مسئلہ زیر غور آیا تھا تو مودودی صاحب نے بھی اپنی دستوری تجاویز پیش کی تھیں۔ اُن میں ایک شق یہ بھی تھی۔

مجالس دستور ساز کی رکنیت کا حق عورتوں کو دینا مغربی قوموں کی اندھی نقالی ہے۔

اسلام کے اصول اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتے۔ اسلام میں سیاست اور انتظام ملکی کی ذمہ داری صرف مردوں پر ڈالی گئی ہے اور یہ فرائض عورتوں کے دائرۂ عمل سے خارج ہیں۔

جب ان کی اس تجویز پر اعتراض ہوا تو انہوں نے ترجمان القرآن کی اشاعت بابت ستمبر ۱۹۵۲ء میں ان اعتراضات کا تفصیلی جواب دیا اور قرآن و احادیث سے ثابت کیا کہ عورتوں کے لئے ملکی انتظامات میں حصہ لینا قطعاً جائز نہیں اور آخر میں لکھا کہ

> اگرچہ ہمارے پاس اپنے نقطۂ نظر کی تائید میں مضبوط عقلی دلائل بھی ہیں اور کوئی چیلنج کرے تو ہم انہیں پیش کر سکتے ہیں۔ مگر اول تو ان کے بارے میں سوال نہیں کیا گیا۔ دوسرے ہم کسی مسلمان کا یہ حق ماننے کے لئے تیار بھی نہیں ہیں کہ وہ خدا اور رسول کے واضح احکام سننے کے بعد ان کی تعمیل کرنے سے پہلے اور تعمیل کے لئے شرط کے طور پر عقلی دلائل کا مطالبہ کرے ..... تعمیل حکم کے لئے عقلی دلائل مانگنے والے کا مقام اسلام کی سرحد سے باہر ہے، نہ کہ اسکے اندر۔

کرنا خدا کا یہ ہوا کہ منصبِ صدارت کے انتخاب کے لئے صدر ایوب کے مقابلہ میں محترمہ مس فاطمہ جناح (مرحومہ) بطور امیدوار کھڑی ہو گئیں۔ مودودی صاحب نے صدر ایوب کی بہرحال مخالفت کرنی تھی اور مخالفت کے معنی یہ تھے کہ ان کے بالمقابل جو امیدوار کھڑا ہو اُس کی حمایت کی جائے لیکن یہاں مشکل یہ آن پڑی کہ مودودی صاحب خدا اور رسول کا یہ فیصلہ منظرِ عام پر لا چکے تھے کہ عورت سیاسی امور میں حصہ لے ہی نہیں سکتی۔ چنانچہ جب یہ مسئلہ جماعت اسلامی کے نمائندگان کی مجلس میں پیش ہوا تو (جماعت کی طرف سے شائع کردہ پمفلٹ میں) اس کشمکش کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا۔

> جب یہ مرحلہ آیا تو ہم اس پیچیدہ صورت حال سے دوچار ہو گئے کہ چار جماعتوں نے محترمہ مس فاطمہ جناح کو منتخب کرنے پر اتفاق کر لیا ہے جسے قبول کرنا اُن شرعی احکام کی موجودگی میں، ہمارے لئے مشکل تھا جن کی رُو سے کوئی عورت مسلمانوں کی امیر نہیں ہو سکتی۔

اس کے بعد درونِ خانہ کیا ہوا، اس کا ہمیں صحیح علم نہیں لیکن باہر بات یہ آئی کہ جماعت اسلامی محترمہ مس فاطمہ جناح کی حمایت کرے گی جب یہ اعتراض کیا گیا کہ اس سے پہلے مودودی صاحب خود اسے ناجائز قرار دے چکے ہیں تو مودودی صاحب نے جو کچھ کہا، اسے روزنامہ مشرق نے اپنی ۱۲ اکتوبر ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں ان الفاظ میں درج کیا تھا۔

اپوزیشن کی صدارتی انتخاب کی امیدوار محترمہ مس فاطمہ جناح پر اعتراض کا جواب دیتے ہوئے مولانا مودودی نے چیلنج کیا ہے کہ کوئی شخص یہ بات ثابت نہیں کر سکتا کہ از روئے شرع عورت کا سربراہِ مملکت ہونا قطعی حرام ہے اور اس سلسلہ میں استثناء کی قطعی گنجائش نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ حکومت لوگوں کو مذہب کے نام پر گمراہ کر رہی ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ اسلام کو کس دھڑلّے سے بدل دیا گیا۔

۱۹۵۰ء کا ذکر ہے کہ محترمہ فاطمہ جناح حیدر آباد کی مجلسِ اسوۂ رسولؐ کی دعوت پر میلاد النبیؐ کے جلسے میں شرکت کے لئے تشریف لے گئیں تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ترجمان القرآن میں لکھا گیا۔

لیکن آپ کو یہ سنکر تعجب ہوگا کہ اس مجلسِ اسوۂ رسولؐ نے اسوۂ رسولؐ بیان کرنے کیلئے جس عالمۂ کتاب و سنت اور پیکرِ اسوۂ رسولؐ کو دعوت دی تھی وہ مس فاطمہ جناح ہیں چنانچہ اخبار نے غالباً موصوفہ کی پیروی اسوۂ رسولؐ ہی کو نمایاں کرنے کے لئے اُن کی تقریر کے ساتھ اُن کی تصویر بھی شائع کی ہے تاکہ مسلمان خواتین اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں کہ اسوۂ رسولؐ در اصل یہ ہے جس پر ملاؤں نے پردہ ڈال دیا تھا اور جو پاکستان بننے کے بعد اب بے نقاب ہو کر سامنے آیا ہے۔ (ترجمان القرآن بابت جولائی۔ اگست ستمبر ۱۹۵۰ء)

لیکن جب وہی محترمہ صدر ایوب کے مقابل منصبِ صدارت کے لئے کھڑی ہوئیں تو مودودی صاحب نے فرمایا۔

اگر کسی امیدوار میں اس کے سوا اور کوئی خامی نہ ہو کہ وہ عورت ہے اور دوسری طرف مرد امیدوار میں اس کے سوا کوئی خوبی نہ ہو کہ وہ مرد ہے تو اس صورت میں اسکے سوا کوئی راستہ باقی نہیں رہ جاتا کہ خاتون امیدوار کی حمایت کی جائے۔ (ایشیا۔ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۶۳ء)

ضمناً جماعتِ اسلامی کو اس سے بڑی شکایت پیدا ہوتی ہے کہ کونسل مسلم لیگ کے بعض سربراہوں نے انہیں انتہا پسند کہہ دیا ہے۔ آپ مندرجہ بالا الفاظ پر غور کیجئے اور سوچئے کہ اس سے بڑی انتہا پسندی کوئی اور بھی ہو سکتی ہے!

۳۔ زرعی اصلاحات

ایک اور مثال لیجئے۔ صدر ایوب نے جب زرعی اصلاحات کے سلسلہ میں زمین کے رقبے کی ملکیت کی حد بندی کی تو جماعتِ اسلامی نے اس کے خلاف طوفان برپا کر دیا کیونکہ مودودی صاحب اس سے پہلے (اپنی کتاب "مسئلہ ملکیتِ زمین") زمین کی ملکیت پر کسی قسم کی حد بندی کو اسلام کی رُو سے قطعاً ناجائز قرار دے چکے تھے، اس کے ساتھ ہی انہوں نے اُس کتاب میں یہ بھی لکھ دیا تھا کہ صنعتوں کو نیشنلائز کرنا ایک ایسا ظلم ہے جس سے بڑھ کر

انسانیت کش نظام ایجاد نہیں کرسکا۔

اس کے بعد صدر ایوب کا دور حکومت ختم ہوا تو مودودی صاحب کے جذبۂ انتقام میں کچھ برودت آگئی تو اس کے ساتھ ہی ان کا اسلام بھی بدل گیا اور اب جماعت اسلامی نے اپنے منشور میں ملکیت زمین یا رقبہ کی حد بندی اور کلیدی صنعتوں کو نیشنلائز کرنے کے حق میں فیصلہ دے دیا ہے۔

۳۔ عائلی قوانین

اب ہم ایک ایسی مثال پیش کرتے ہیں جس کی ایک ایک شق سے یہ واضح ہو گا کہ جن چیزوں کو مودودی صاحب صدر ایوب کے برسر اقتدار آنے سے پہلے اسلام کی رو سے نہایت ضروری قرار دیتے تھے، جب انہی چیزوں کو صدر ایوب نے نافذ کیا تو انہوں نے ان میں سے ایک ایک کی مخالفت کی اور انہیں خلاف اسلام قرار دے دیا۔ ہمارا مطلب عائلی قوانین سے ہے۔ عائلی قوانین کے خلاف جماعت اسلامی نے جو قیامت برپا کی تھی، اس کی آوازیں آج تک فضا میں گونج رہی ہیں۔

ہمارے ملک میں عائلی قوانین کا نفاذ کوئی اچانک قدم نہیں تھا بلکہ پچھلی پوری صدی سے حالات اس کا تقاضا کر رہے تھے۔ یہ ایک دردناک حقیقت ہے کہ ہماری عائلی زندگی کے بعض اہم قوانین ملوکیت سے متاثر تھے اور جب خود ملوکیت دم توڑنے لگی تو عائلی زندگی میں بھی تبدیلیاں ناگزیر ہو گئیں۔ اس سے متعلق سب سے پہلے اصلاحی اقدامات مصر اور دوسرے عرب ممالک میں کئے گئے۔ لیکن یہ اصلاحات اتنی ہی تھیں کہ اصلاح طلب معاملات میں حنفی فقہ کو ترک کر کے دوسرے فقہی مذاہب کے قوانین کو اختیار کر لیا گیا۔ پاکستان میں بھی عائلی قوانین کے تحت کم و بیش وہی اصلاحات نافذ کی گئیں جو عرب ممالک میں چالیس سال پہلے اختیار کی جا چکی تھیں۔

ہمارے ہاں اکثریت حنفی فقہ کی پابند تھی۔ اسلئے ہماری لاکھوں بیٹیوں اور بہنوں کی زندگیوں کو اجڑتے ہوئے دیکھنے کے باوجود کسی کو جرأت نہیں ہوتی تھی کہ اس فقہ کی مخالفت میں آواز اٹھائے۔ مودودی صاحب نے جب مصر اور دوسرے عرب ممالک میں عائلی اصلاحات کا خوشگوار استقبال دیکھا تو انہوں نے مصر میں رائج شدہ اصلاحات کو سامنے رکھ کر اپنی کتاب "حقوق الزوجین" تصنیف فرمائی۔ اس کتاب میں انہوں نے عائلی اصلاحات کی مخالفت کرنے والے علماء کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

> قیامت کے روز حق تعالیٰ کے سامنے ان گنہگاروں کے ساتھ ساتھ ان کے دینی پیشوا بھی پکڑے ہوئے آئینگے اور اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ کیا ہم نے تم کو علم و عقل سے اس لئے سرفراز

کیا تھا کہ تم اس سے کام نہ لو. کیا ہماری کتاب اور ہمارے نبی کی سنت تمہارے پاس اسلئے تھی کہ تم اس کو لئے بیٹھے رہو اور مسلمان گمراہی میں مبتلا ہوتے رہیں. ہم نے اپنے دین کو آسان بنایا تھا. تم کو کیا حق تھا کہ اسے مشکل بناتے. ہم نے تم کو قرآن اور محمدؐ کی پیروی کا حکم دیا تھا. تم پر یہ کس نے فرض کیا کہ ان دونوں سے بڑھ کر اپنے اسلاف کی پیروی کرو. ہم نے ہر مشکل کا علاج قرآن میں لکھا تھا. آپ سے کس نے کہا کہ قرآن کو ہاتھ نہ لگاؤ اور اپنے لئے انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کو کافی سمجھو. اس بازپرس کے جواب میں امید نہیں کہ کسی عالم دین کو کنز الدقائق اور عالمگیری کے مصنفوں کے دامن میں پناہ مل سکے گی.

(حقوق الزوجین طبع ششم صفحہ ۹۸)

فقہی قوانین کی رُو سے ہمارے گھروں کی زندگیاں کس قدر جہنم زار بن چکی تھیں' اس کے متعلق مودودی صاحب نے لکھا تھا.

اس افسوسناک حالت نے مسلمانوں کی تمدنی زندگی کو جو نقصانات پہنچائے ہیں' ان میں سب سے زیادہ اہم نقصان یہ ہے کہ اس نے ہمارے کم از کم پچھتر فیصد گھروں کو دوزخ کا نمونہ بنا دیا ہے اور ہماری آبادی کے ایک بڑے حصے کی زندگیاں تلخ بلکہ برباد کر دی ہیں.

(ایضاً. صفحہ ۹)

ہمارے گھروں کی تلخ زندگیوں کا یہی احساس تھا جس کے پیشِ نظر صدر ایوب کے زمانے میں عائلی قوانین نافذ کئے گئے تھے. مودودی صاحب کو سب سے پہلے ان قوانین کا استقبال کرنا اور حکومت کو مستحق مبارکباد قرار دینا چاہیئے تھا. لیکن بدقسمتی یہ کہ یہ قوانین صدر ایوب کے ہاتھوں نافذ ہوئے. اسلئے مودودی صاحب کیطرف سے ان کی مخالفت ان کے جذبۂ انتقام کا تقاضا تھا. آپ دیکھئے کہ عائلی قوانین میں کیا کہا گیا تھا. ان قوانین کے نفاذ سے پہلے مودودی صاحب اس ضمن میں خود کیا لکھ چکے تھے اور پھر اس کے بعد انہوں نے اُن کی کس طرح مخالفت کی.

نکاح کی رجسٹری

نکاح کے وقت فریقین کے درمیان کچھ شرائط طے پاتی ہیں. اس سے پہلے یہ شرائط بالعموم زبانی طے پاتی تھیں. اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ بعد میں بڑے جھگڑے اُٹھتے تھے ایک فریق کچھ دعویٰ کرتا تھا دوسرا فریق اس سے انکار کر دیتا تھا. یہ جھگڑے بالعموم مہر کے متعلق ہوتے تھے جو فوری ادا نہیں کیا جاتا تھا. مودودی صاحب نے اس کا یہ حل بتایا کہ

اگر وہ (مہر) مؤجل ہو تو لازم قرار دیا جائے (کہ اس دستاویز کو رجسٹر کرایا جائے) اور زرِ مہر پر پچاس فیصد کا اسٹامپ لگایا جائے. اسٹامپ کے بغیر یا پچاس فیصد سے کم قیمت کے اسٹامپ پر کوئی دستاویزِ مہر قابلِ ادخالِ دعویٰ نہ ہو. اس قسم کا ضابطہ اگر بنا دیا جائے

تو مہر موجّل کا یہ سراپا عیب بہ آسانی مسدود ہو جائیگا۔ (ایضاً - صفحہ ۱۲۵)

صدر ایوب نے یہ ضابطہ بنا دیا اور عائلی قوانین کی رُو سے نکاح کی دستاویز کا رجسٹر کرانا لازمی قرار دے دیا۔ اس فرق کے ساتھ کہ مودودی کی تجویز کی رُو سے اس دستاویز پر اتنی گراں قیمت اسٹامپ لگانی پڑتی تھی اور عائلی قوانین کی رُو سے یہ دستاویز دو تین روپوں میں رجسٹر ہو جاتی تھی۔ لیکن مودودی صاحب نے اس کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ اس قسم کے نجی معاملے میں عدالت کو خواہ مخواہ دخل انداز کر لیا گیا ہے۔

تعدد ازدواج

عائلی قوانین میں ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی کرنے کے لئے یہ شرط عائد کر دی گئی ہے کہ اس کے لئے پہلی بیوی کی رضامندی حاصل کرنا ضروری ہے۔ ایسی رضامندی حاصل کرنے کے بعد معاملہ ثالثی کونسل کے سامنے جائے گا۔ اگر ثالثی کونسل مطمئن ہو کہ مجوزہ شادی ضروری اور عدل کے تقاضے کے مطابق ہے تو وہ ایسی شرائط کے تحت جنہیں وہ مناسب خیال کرے مطلوبہ منظوری دے سکتی ہے ثالثی کونسل کے فیصلے کے خلاف نگرانی کی درخواست بھی دیجا سکتی ہے۔

آپنے دیکھا ہو گا کہ دوسری شادی کے لئے یہ شرائط پہلی بیوی کے حقوق کی کسی حد تک حفاظت کرتی ہیں اور مرد کو کھلی چھٹی نہیں دی جاتی کہ وہ جب جی چاہے دو تین چار تک بیویاں کر لے۔ پہلی بیوی یا اُس کے متعلقین کی رضامندی حاصل کرنے کا ثبوت خود نبی اکرمؐ کی ایک حدیث میں موجود ہے جس میں کہا گیا ہے کہ حضورؐ نے برسرِ منبر فرمایا۔ کہ بنو ہاشم بن مغیرہ نے مجھ سے اجازت چاہی ہے کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی حضرت علیؓ سے کر دیں۔ میں ہرگز ہرگز اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ ہاں اگر ابنِ ابی طالب ایسا کرنا چاہتے ہیں تو میری بیٹی کو طلاق دے کر اُن کی بیٹی سے نکاح کر لیں۔ فاطمہ میرا جگر گوشہ ہے۔ جو بات اُسے تکلیف پہنچاتی ہے وہ میرے لئے بھی باعثِ تکلیف ہے۔ جو اس کے لئے موجب ایذا ہے وہ مجھے بھی ایذا پہنچاتی ہے (بخاری۔ کتاب النکاح)۔ اس سے واضح ہے کہ دوسری شادی کے لئے پہلی بیوی یا اُس کے متعلقین کی رضامندی سنّتِ رسول اللہ کے مطابق ہے۔ اور اس کے لئے ثالثی کونسل سے منظوری لینا اس مسئلہ کو بڑی حد تک انصاف کے قریب کر دیتی ہے۔

لیکن مودودی صاحب نے اس کے خلاف آسمان سر پر اٹھا لیا اور کہا کہ جب اسلام مرد کو بلا مشروط چار بیویوں تک سے نکاح کرنے کی اجازت دیتا ہے تو حکومت کون ہوتی ہے جو اس میں دخل دے۔ اور ایسا کہتے وقت وہ بھول گئے کہ وہ اس باب میں اس سے پہلے یہ لکھ چکے ہیں کہ

> قرآن مجید میں تعدد ازواج کی اجازت عدل کی شرط کے ساتھ دی گئی ہے۔ اگر کوئی شخص عدل نہ کرے تو اُسے اس مشروط اجازت سے فائدہ اٹھانے کا حق نہیں ہے۔ خود اس آیت میں جہاں تعدد ازواج کی اجازت دی گئی ہے صاف حکم موجود ہے کہ اگر عدل نہ کر

سکو تو پھر ایک ہی بیوی رکھو .... اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ جو شخص دو یا زاید بیویوں کے درمیان عدل نہیں کرتا اور ایک طرف جھک کر دوسرے کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کرتا ہے وہ ظالم ہے۔ تعدد ازدواج کی اجازت سے فائدہ اٹھانے کا اس کو کوئی حق نہیں ہے۔ قانون کو ایسی حالت میں اسے صرف ایک بیوی رکھنے پر مجبور کرنا چاہیئے اور دوسری بیوی یا بیویوں کو اس کے خلاف قانون سے دادرسی پانے کا حق ہونا چاہیئے۔

(ایضاً صفحہ ۴۱، ۴۲)

مودودی صاحب نے خود اس کی سفارش کی اور جب عائلی قوانین میں پہلی بیوی کے لئے دادرسی پانے کا حق دیا گیا تو قیامت برپا کر دی کہ یہ خلافِ اسلام ہے۔ محض اس لئے کہ یہ قانون اس شخص کی طرف سے نافذ کیا گیا تھا جس کے خلاف مودودی صاحب کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔

عورت کا خُلع کا شرعی حق

مودودی صاحب نے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں لکھا تھا کہ شریعِ اسلامی نے جس طرح مرد کو یہ حق دیا ہے کہ جس عورت کو وہ ناپسند کرتا ہے اور جس کے ساتھ وہ نباہ نہیں کر سکتا اُسے طلاق دیدے' اسی طرح عورت کو بھی یہ حق دیا گیا ہے کہ جس مرد کو وہ ناپسند کرتی ہے اور کسی طرح اس کے ساتھ گذر بسر نہ کر سکتی ہو، اس سے خلع حاصل کرے۔ (ایضاً صفحہ ۔۔)

آپ نے دیکھا کہ بات کتنی صاف ہے۔ لیکن جب عائلی قوانین میں یہ شق رکھی گئی تو مودودی صاحب نے قیامت برپا کر دی کہ عورت کو اس کا حق دینا اسلام کے خلاف ہے۔

تین طلاقیں

مسلمانوں کی خانگی زندگی کو جس مسئلے نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے وہ "تین طلاق" کا مسئلہ ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر ایک شخص اپنی بیوی سے "طلاق، طلاق، طلاق" کہدے۔ (یعنی لفظ طلاق کو تین مرتبہ دہرا دے) تو اس سے اس بیوی پر اس قسم کی طلاق پڑ جاتی ہے کہ یہ میاں بیوی پھر آپس میں نکاح نہیں کر سکتے، بجز اس کے کہ وہ عورت بیچاری کسی اور مرد سے ایک رات کے لئے نکاح کرے' اور وہ مرد اسے شب باشی کے بعد دوسری صبح کو طلاق دے۔ اس کے بعد یہ اپنے پہلے خاوند سے دوبارہ نکاح کر سکتی ہے۔ یہ مسئلہ جس قدر تباہ کن ہی نہیں بلکہ شرمناک ہے' اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ سب سے پہلے حکومتِ مصر نے جرأت مندانہ قدم اٹھا کر اسکا خاتمہ کیا۔ ہمارے ہاں بھی حکومتِ مصر کے اس اقدام کی بڑی تعریف کی گئی اور" دعا کی گئی کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی وہ دن جلد از جلد دکھائے جب ہم اس لعنت کا خاتمہ کر سکیں"۔

(ملاحظہ ہو نکاح محمدی۔ از مولانا محمد بن ابراہیم جونا گڑھی مرحوم۔ صفحہ ۲۲-۲۱)

اس قسم کی طلاق کے متعلق مودودی صاحب نے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں لکھا تھا کہ

ایک وقت تین طلاق دے کر عورت کو جدا کر دینا نصوصِ صریحہ کی بنا پر معصیت ہے۔ علمائے امت کے درمیان اس مسئلہ میں جو کچھ اختلاف ہے وہ اس امر میں ہے کہ ایسی تین طلاقیں ایک طلاق رجعی کے حکم میں ہیں یا تین طلاق مغلظہ کے حکم میں۔ لیکن اس کے بدعت اور معصیت ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں۔ سب تسلیم کرتے ہیں کہ یہ فعل اس طریقہ کے خلاف ہے جو اللہ اور اُسکے رسول نے طلاق کے لئے مقرر فرمایا ہے اور اس سے شریعت کی اہم مصلحتیں فوت ہو جاتی ہیں۔

(صفحہ ۱۵۴)

اس لعنت کو ختم کرنے کے سلسلے میں آپنے یہ تجویز فرمایا تھا کہ

ہمارے زمانے میں یہ طریقہ عام ہو گیا ہے کہ کسی فوری جذبہ کے تحت لوگ (اپنی بیویوں کو) حبطِ تین طلاقیں دے ڈالتے ہیں۔ پھر نادم ہوتے ہیں اور شرعی حیلے تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ کوئی جھوٹی قسمیں کھا کر طلاق سے انکار کرتا ہے، کوئی حلالہ کرانے کی کوشش کرتا ہے اور کوئی طلاق کو مخفی رکھ کر اپنی بیوی کا سے بدستور سابق تعلقات باقی رکھتا ہے۔ اس طرح ایک گناہ کے خمیازے سے بچنے کے لئے متعدد دوسرے گناہوں کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ ان خرابیوں کا سدباب کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے کر عورت کو جدا کر دینے پر ایسی پابندیاں عائد کر دی جائیں جن کی وجہ سے لوگ اس فعل کا ارتکاب نہ کر سکیں۔ (ایضاً ۱۵۵)

لیکن جب عائلی قوانین میں اس قسم کی پابندیاں لگا دی گئیں تو اس کی مخالفت کرنے والوں میں مودودی صاحب پیش پیش تھے۔ انہوں نے اس پابندی کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

بلاشبہ یہ چیز بعض فقہی مذاہب[1] کے نزدیک درست ہے لیکن حنفی مذہب کے خلاف ہے۔ حنفی مذہب میں اگر تین طلاق بیک وقت دیئے گئے ہوں تو اس سے طلاق مغلظہ واقع ہو جاتی ہے اور مطلقہ عورت سے اس کا سابق شوہر نہ تو مدت عدت کے اندر رجوع کر سکتا ہے جب تک کہ اسکی تحلیل[2] نہ ہو جائے۔ اس ملک کے باشندوں کی عظیم اکثریت حنفی ہے۔ ان حنفی باشندوں کو جو اعتماد امام ابوحنیفہؒ اور مذہب حنفی کے ائمہ و فقہاء کے علم و تقویٰ پر ہے وہ اعتماد آجکل کے

---

[1] مودودی صاحب نے "کتاب بے سنت" جیسے کے بجائے دانستہ محض غلط فہمی پیدا کرنے کے لئے بعض فقہی مذاہب لکھ دیا ہے۔

[2] یہ رسوائے عالم حلالہ کے لئے خوبصورت اصطلاح وضع کی گئی ہے۔ تفصیل ذرا آگے چلکر سامنے آئیگی۔

قانون سازوں پر نہیں۔ (عائلی قوانین پر علماء کے اعتراضات، صفحہ ۱۹-۱۸)

جب مودودی صاحب نے یہ لکھا تھا کہ اس قسم کی طلاق نصوص صریحہ کی بنا پر معصیت ہے اور اسکے بدعت اور معصیت ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں اور یہ تجویز کیا تھا کہ ایسی طلاق پر قانونی پابندیاں عاید کرنا ضروری ہے تو اس وقت یہاں حنفی مذہب بھی موجود تھا اور اس کے پیرو بھی موجود تھے۔ اس وقت مودودی صاحب کو اس قسم کا کوئی خیال نہیں آیا۔ لیکن جب صدر ایوب کی طرف سے نافذ کردہ عائلی قوانین کی رُو سے مودودی صاحب کی مجوزہ پابندی لگا دی گئی تو انہوں نے حنفی فقہ کی متبع عظیم اکثریت کو یہ کہہ کر صدر ایوب کے خلاف بھڑکایا کہ دیکھو یہ شخص ایسے قوانین نافذ کر رہا ہے جو فقہ حنفی کے خلاف ہیں۔ بتاؤ تم امام ابو حنیفہؒ کی پیروی کرنا چاہتے ہو یا صدر ایوب کی ؟

آپ نے دیکھا کہ یہ شخص کس قدر خطرناک ہے اور اسلام کو کس طرح ایک کھلونا بنا کر اپنے مخالفین کے خلاف ہینڈ گرنیڈ کی طرح استعمال کرتا چلا جاتا ہے۔

حلالہ مودودی صاحب نے تین طلاق بہ یک وقت کو فقہ حنفی کی رُو سے جائز قرار دینے کے ساتھ یہ بھی فرمایا ہے کہ اس کے بعد حلالہ کر لیا جائے تو پھر سابقہ شوہر کے ساتھ نکاح جائز قرار پا جاتا ہے۔ اس میں حلالہ کا ذکر ایسا سرسری طور پر کیا گیا ہے جیسے یہ کوئی چھوٹی سے بانٹنے کی رسم ہو جسے ادا کر لینے کے بعد سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس "انقلابی اسلام" سے پہلے یہی صاحب حلالہ کے متعلق کیا کہتے تھے؟ سنیئے اور حیرت سے اپنی انگلی دانتوں میں دبا لیجئے۔ انہوں نے اپنی کتاب حقوق الزوجین میں لکھا تھا۔

> فی الواقعہ اس طرح کے نکاح اور زنا میں کوئی فرق نہیں ہے۔ حیرت اُن علماء پر ہوتی ہے جو اس صریح حرام اور نہایت شنیع اور شرمناک حیلے کا فتویٰ لوگوں کو دیتے ہیں۔ (صفحہ ۶۰-۵۹)

یعنی وہی فعل جو مودودی صاحب کے نزدیک حرام، نہایت شنیع، شرمناک اور زنا تھا جب ان کے فریق مخالف نے اُس پر پابندی لگائی تو وہ بالکل جائز قرار پا گیا۔ اور پابندی لگانے والے کی مخالفت یہ کہہ کر شروع کر دی گئی کہ وہ شریعت حقہ کے خلاف قوانین رائج کر رہا ہے۔ مودودی صاحب نے اُن علماء کے متعلق حیرت کا اظہار کیا ہے جو اس قسم کے شرمناک حیلے کا فتویٰ لوگوں کو دیتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ علماء کون ہیں۔ یہ علماء اسی حنفی مذہب کے متبع ہیں جسے پاکستان میں رائج کرنے کا مشورہ مودودی صاحب دے رہے ہیں۔ حنفی فقہ کی مشہور و معتبر کتاب ہدایہ میں ہے۔

> اگر حلالہ کی شرط سے کسی عورت سے نکاح کیا گیا تو وہ نکاح مکروہ ہوگا کیونکہ حضورؐ نے جہاں حلالہ کرنے اور حلالہ کرانے والوں پر اللہ کی لعنت بھیجی ہے تو اس سے یہی حلالہ مراد ہے۔ تاہم اگر اس حلالہ کے نکاح کے بعد کوئی شخص عورت سے بعد از مباشرت اُسے طلاق دے دے تو وہ پہلے شوہر کے لئے حلال ہو جائیگی کیونکہ دخول نکاح صحیح میں ہوا ہے۔ (ہدایہ اولین مجیدی ص ۳۹۹)

مرد کا حق طلاق عائلی قوانین میں مرد کے حق طلاق پر اتنی سی پابندی عاید کی گئی ہے کہ اس مقصد کے لئے اُسے یونین کونسل کے چیئرمین کو اطلاع دینی ہوگی جو فریقین میں مصالحت کی کوشش کرے گا۔ اور اگر وہ اس کوشش میں ناکام ہوگا تو پھر تین ماہ کے بعد طلاق مؤثر ہو جائے گی۔

مودودی صاحب نے شور مچا دیا کہ یہ پابندی مداخلت فی الدین ہے جس کا حکومت کو کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ انہوں نے کہا۔

> ایک آیت میں تو صاف الفاظ میں بیدہٖ عقدۃ النکاح کا فقرہ ارشاد فرمایا گیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے نکاح کو برقرار رکھنا یا توڑ دینا شوہر کے اختیار میں ہے۔ اس اختیار کو استعمال کرنے کے لئے وہ قطعاً کسی دوسرے کی طرف رجوع کرنے کا پابند نہیں ہے۔
>
> (عائلی قوانین پر علماء کے اعتراضات۔ صفحہ ۱۵)

لیکن اس سے پہلے مودودی صاحب نے "حقوق الزوجین" میں لکھا تھا کہ

> اگر اُس کی شکایت جائز ثابت ہوگی تو قانون کو نافذ کرنے والوں یعنی اولی الامر کو حق حاصل ہوگا کہ شوہر کو اُس کے اختیار سے محروم کر کے بطور خود اس اختیار کو استعمال کریں۔ قاضی کو فسخ اور تفریق اور تطلیق کے جو اختیارات شرع میں دیئے گئے ہیں وہ اسی اصل پر مبنی ہیں۔ فقہا کی ایک جماعت نے بیدہٖ عقدۃ النکاح سے یہ استدلال کیا ہے کہ طلاق کا جو اختیار مرد کو دیا گیا ہے وہ کسی شرط کے ساتھ مشروط نہیں اور اس قاعدہ میں کوئی استثناء نہیں۔ اور اگر مرد طلاق دینے پر راضی نہ ہو تو کسی حال میں قاضی کو یہ اقتدار نہیں ہے کہ اس اختیار کو خود اپنے ہاتھ میں لے کر استعمال کرے۔ لیکن قرآن مجید اس استدلال کی تائید نہیں کرتا۔
>
> (صفحہ ۱۰۸)

یعنی مودودی صاحب قرآن مجید کی جس آیت سے یہ ثابت کرتے تھے کہ طلاق کے معاملہ میں عدالت کو مداخلت کا حق حاصل ہے عائلی قوانین کے نفاذ کے بعد اُسی آیت سے یہ ثابت کر رہے ہیں کہ عدالت کو مداخلت کا ہرگز حق حاصل نہیں ہے۔ یہ اس لئے کہ یہ قوانین اُس شخص کے عہد اقتدار میں نافذ ہوئے تھے جس کے خلاف ان کے دل میں بغض و عداوت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اور پھر یہ بھی واضح رہے کہ عائلی قوانین میں بھی نہ تو مرد سے حق طلاق سلب کیا گیا ہے اور نہ ہی عدالت کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ مرد کی رضامندی کے بغیر خود طلاق نافذ کرے۔ اُس میں صرف اتنا ہی کہا گیا ہے کہ مرد اس کی اطلاع یونین کونسل کے چیئرمین کو دے تاکہ وہ فریقین میں مصالحت کی کوشش کر دیکھے۔ مودودی صاحب کے "حقوق الزوجین" کے فتویٰ کی رُو سے عدالت کو اس کا حق حاصل ہے کہ خاوند کی رضامندی کے بغیر بھی

تسخ نکاح کرشے لیکن صدر ایوب کے نافذ کردہ عائلی قوانین کی اتنی سی پابندی بھی خلافِ شریعت قرار دے دی جاتی ہے کہ کونسل کا چیرمین فریقین میں مصالحت کی کوشش کرے حالانکہ مصالحت کا حکم خود قرآن کریم نے دیا ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ مودودی صاحب خدا کی کتاب کے ساتھ کس قسم کا مذاق کرتے ہیں۔

صغرسنی کی شادی

صغرسنی کی شادیوں سے مسلم معاشرے میں جو خرابیاں پیدا ہو رہی تھیں ہر خاص و عام کو اس کا احساس تھا۔ اس کے خلاف مصر میں انقلابی قدم اٹھایا گیا اور شادی کے لئے بالغ ہونے کی شرط لازم قرار دی گئی۔ یہ قانون فقہی مذہب کے ایک امام ابن شبرمہ کے مسلک کے مطابق تھا۔ ان کا یہ مسلک بڑا مشہور ہے اور حنفی فقہ کی کتابوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ علامہ سرخسی نے بھی اپنی مشہور کتاب المبسوط (جلد چہارم صفحہ ۱۹۳ پر) لکھا ہے۔

> امام ابن شبرمہ اور ابوبکر اصم نابالغ لڑکے اور نابالغ لڑکی کی شادی کو جائز قرار نہیں دیتے۔ ان کی دلیل یہ ارشاد باری تعالےٰ ہے۔ حتیٰ اذا بلغوا النکاح۔ اگر بلوغت سے پہلے نکاح جائز ہوتا تو یہ آیت بے سود تھی۔

عائلی قوانین میں بھی شادی کے لئے بلوغت کی شرط لازم قرار دی گئی تو اس پر طوفان مچا دیا گیا کہ "یہ قرآن کے صریح حکم کے خلاف اور ان مصالح سے متصادم ہے جنہیں شریعت نے اہمیت دی ہے۔ قرآن مجید میں بالفاظ صریح ایسی لڑکی کے ساتھ نکاح کو جائز قرار دیا گیا ہے جس کو ابھی تک حیض نہ آیا ہو۔"

(عائلی قوانین پر علماء کے اعتراضات۔ صفحہ ۱۹)

حالانکہ اس سے پہلے خود مودودی صاحب یہ ارشاد فرما چکے تھے کہ

> اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ کم سنی کے نکاحوں کی روک تھام کی جائے اور کم از کم ایسے نکاحوں کو لازم قرار نہ دیا جائے کیونکہ اکثر لڑکے جن سے ابتدا میں اچھی توقعات قائم کی جاتی ہیں آگے چل کر سخت بداخلاقیوں، بُری عادتوں۔ اور فاسد اعتقادات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔
>
> (حقوق الزوجین۔ صفحہ ۱۱۹)

یعنی جس چیز کے متعلق یہ کہا تھا کہ اس پر پابندی لگانا نہایت ضروری ہے جب عائلی قوانین میں وہ پابندی لگائی گئی تو اس پابندی کو خلافِ اسلام قرار دے کر پابندی لگانے والے کے خلاف قیامت برپا کر دی گئی۔

(۶)

آپ نے ان چند مثالوں سے دیکھ لیا ہو گا کہ مودودی صاحب اسلام کے خلاف کیا کھیل کھیل رہے ہیں۔ اور جس شخص کے خلاف ان کے دل میں انتقام کی آگ بھڑکے، اسکے خلاف پروپیگنڈا کرنے میں کس حد تک آگے بڑھ

جاتے ہیں۔ ہمیں نہ صدر ایوب سے کوئی تعلق ہے نہ عائلی قوانین سے براہِ راست کوئی واسطہ۔ ہم اس مثال سے بتانا صرف یہ چاہتے ہیں کہ ایک مثال کو مودودی صاحب خود خلافِ اسلام قرار دے کر سفارش کرتے ہیں کہ اس پر پابندی لگا دی جائے۔ جب اس پر پابندی لگا دی جاتی ہے۔ تو چونکہ بدقسمتی سے وہ پابندی اس شخص کی طرف سے نافذ ہوتی ہے جو ان کا فریقِ مخالف ہے، اس لئے مودودی صاحب خود اس پابندی کو خلافِ اسلام قرار دے کر دہائی مچا دیتے ہیں کہ لوگو دیکھو! یہ شخص تمہارے اسلام پر کس طرح ڈاکہ ڈال رہا ہے اور تمہاری مقدس شریعت کی کیسے توہین کر رہا ہے۔

ہمیں مودودی صاحب پر چنداں افسوس نہیں کہ ان کے سامنے زندگی کا صرف ایک مقصد ہے اور وہ ہے اپنی ہوسِ اقتدار کی تسکین۔ اس کے لئے وہ ہر جائز و ناجائز حربے کو بلا دریغ استعمال کرتے ہیں اور اپنے ہر اقدام کو عین مطابقِ اسلام قرار دیتے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے ان کے متبعین پر جن میں بہر حال پڑھے لکھے لوگ بھی شامل ہیں۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ مودودی صاحب کس طرح خود اپنی تحریروں کی مخالفت کرتے ہیں جس چیز کو آج خلافِ اسلام کہتے ہیں کل اسی کو عین مطابقِ اسلام قرار دیتے ہیں جسے آج شریعت کا حکم اور خدا اور رسولؐ کا فیصلہ کہتے ہیں اسے دوسرے وقت میں کفر و الحاد سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور حیرت ہے کہ اس کے خلاف ایک لفظ تک زبان پر نہیں لاتے۔ ہم یہ نہیں سمجھتے کہ ان میں سے ہر ایک کی یہ حالت ہے کہ

زر برسرِ فولاد نہی نرم شود

ان میں ایسے لوگ بھی تو ہوں گے جنہیں روپے پیسے کا لالچ نہیں ہوگا۔ حیرت ان پر آتی ہے کہ ان کی عقل و فکر اس درجہ مفلوج کر دی گئی ہے کہ وہ مودودی صاحب کی دو متضاد تحریروں کو آمنے سامنے رکھ کر اتنا فیصلہ کرنے کے بھی قابل نہیں رہے کہ جو شخص آج کچھ کہتا ہے اور کل کچھ، اور اپنی ان دونوں باتوں کو مطابقِ اسلام بتاتا ہے اس کا ساتھ کس طرح دیا جا سکتا ہے۔ عقل و بصیرت اور دیانت و امانت تو اس قسم کی رفاقت کی کبھی اجازت نہیں دے سکتی۔ ایسا کیوں اور کس طرح ہو رہا ہے، یہ وہ راز ہے جس کا سمجھنا کم از کم ہمارے جیسے "سادہ دل بندوں" کے توبس کی بات نہیں۔

(۔۔۔)

جہانِ نو

وہ کتابچہ جس میں طلوعِ اسلام کے شائع کردہ انقلاب آفریں لٹریچر کا تفصیلی تعارف کرایا گیا ہے۔ ایک کارڈ لکھ کر مفت طلب فرمائیے!

اس قسم کا لٹریچر آپ کو اور کہیں نہیں مل سکیگا۔

(ناظم)

اسلامی مملکت میں

مذہبی پیشوائیت کیلئے کوئی گنجائش نہیں ہوتی

ہمارے ہاں یہ خیال عام ہے کہ دنیاوی امور کے فیصلے تو حکومت کی طرف سے کئے جائینگے، لیکن دینی معاملات کے متعلق ہمیں بہرحال علمار کرام کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ اس غلط فہمی میں، جہلا ہی نہیں، اچھے خاصے لکھے پڑھے لوگ بھی مبتلا ہیں (مثلاً) ، پچھلے دنوں، کراچی کے روزنامہ جنگ میں "دینی مسائل" کے عنوان سے ایک مبسوط مقالہ شائع ہوا ہے جس میں اس خیال کی تائید اور وضاحت کی گئی ہے۔ چونکہ یہ سوال بڑا اہم ہے اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ صاحب مقالہ کا پورا منشار قارئین کے سامنے آجائے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"ہمارے دینی مسائل پر رائے دینے کا حق کس کو حاصل ہے؟ ان لوگوں کو جو دینی علوم پر عبور رکھتے ہیں، یا ایسے لوگوں کو جو اور تو سب کچھ جانتے ہیں مگر دین کے متعلق کچھ نہیں جانتے؟

پہلا سوال یہ ہے کہ آیا دین کے بارے میں ایسے سوالات پیدا ہوسکتے ہیں یا نہیں جن کے بارے میں کسی سے رائے لینا ضروری ہو؟ جس طرح انسانی زندگی سے متعلق دوسرے معاملات میں اختلافات پیدا ہوتے رہتے ہیں اسی طرح دینی مسائل کے بارے میں بھی اختلافات کا پیدا ہونا امر فطری ہے۔ کون سا دین ایسا ہے جس کے سلسلے میں اختلافات پیدا نہیں ہوتے ہیں۔ اختلافات ضرور پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ البتہ ان اختلافات کو مٹانے کے لئے ہر دینی نظام میں ایسے اداروں کا بندوبست رہتا ہے جو ان اختلافات کے بارے میں خالصتہً دینی علوم کی روشنی میں فیصلے صادر کرتے رہیں۔ ان اداروں میں ہمیشہ ایسے لوگوں کو رکھا جاتا ہے جو عالم دین ہوں۔

عیسائیوں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ان کا ایک پوپ ہے جو مذہبی امور میں سپریم کورٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔ پوپ کے نیچے کارڈینل۔ آرچ بشپ اور بشپ ہوتے ہیں۔ ان مناصب پر ادھر سے ادھر سے پکڑ کر لوگوں کو نہیں بٹھا دیا جاتا ہے۔ وہاں پر صرف ایسے لوگوں کو بٹھایا جاتا ہے جو چوٹی کے عالم دین ہوں اور جنہوں نے اپنی زندگی

کا بیشتر حصہ تحصیل علم دین میں صرف کر دیا ہو۔ یہ لوگ جب کسی دینی مسئلہ کے بارے میں فیصلہ دیتے ہیں تو اس دین سے تعلق رکھنے والی جملہ اقوام کو وہ فیصلہ ماننا پڑتا ہے۔ اٹلی رومن کیتھولک مذہب سے وابستہ ہے۔ وہاں دینی مسائل کے بارے میں فیصلہ کا اختیار رومن کیتھولک دینی اداروں کو حاصل ہے۔ وہاں یہ نہیں ہوتا کہ دینی ادارے تو ایک فیصلہ دیں اور صاحب اثر لوگ، لیڈر یا وزیر یہ اعلان فرما دیں کہ "ہم یہ فیصلہ اسلئے نہیں مانتے کہ ان لوگوں کا کام ہی ہے جھوٹے فتوے صادر کرنا۔ مثلاً فلاں دور میں انہوں نے یہ فتویٰ دیا تھا، یا فلاں بڑے آدمی کو فلاں زمانہ میں انہوں نے کافر قرار دیا تھا۔ اگر اس قسم کی گستاخی کسی بڑے آدمی سے سرزد ہو جائے تو اس کے لئے کیتھولک سوسائٹی میں رہنا ناممکن بن جائے۔ اس کو نہ کیتھولک قبرستان میں جگہ ملے گی، نہ اس کا مذہبی رسوم کے مطابق شادی بیاہ ہو سکے گا۔ نہ اس کی بیوی اس کے پاس رہے گی نہ مرنے کے وقت اسکو SACRAMENTS مل سکینگے۔ گویا وہ زندہ رہا تو اپنے قبیلہ سے باہر، اور مرا تو جانور کی طرح۔ سولہویں صدی میں انگریز بادشاہ ہنری ہشتم نے اپنے رومن کیتھولک چرچ کے بعض فیصلے نہیں مانے تو اس کی پاداش میں نہ صرف بادشاہ کو بلکہ ساری قوم کو جس نے پوپ کے فیصلے کے خلاف اپنے بادشاہ کا ساتھ دیا، کیتھولک مذہب سے خارج ہونا پڑا۔ وہاں یہ نہیں ہوا کہ بادشاہ ہنری یا انگریز قوم یہ موقف اختیار کر لے کہ "ہم رہیں گے تو تمہارے مذہب میں مگر فیصلے تمہارے نہیں مانیں گے۔

اسی طرح یہودی قوم کا بھی یہ قانون ہے کہ مذہبی امور میں مذہبی پیشواؤں اور علمائے دین کا فیصلہ ہی آخری فیصلہ ہوتا ہے۔ کسی حاکم یا فرد واحد کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ان کے فیصلوں کا تمسخر اڑائے یا ان کی ذات پر حملہ کرے۔

خود ہماری اپنی تاریخ اس بات کی بہترین گواہ ہے کہ جب اسلام آزاد تھا تو مذہبی امور میں وقت کے بادشاہوں کو بھی علماء اور قاضیوں کے فیصلے ماننے پڑتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ "جس کا کام وہی جانے" علم دین علمائے دین ہی جانتے تھے، لہٰذا دینی معاملات میں ان کے فیصلوں پر ہی عمل کیا جاتا تھا۔

تو اس صورت حال کے پیش نظر اصول یہ ٹھہرا کہ اگر کسی شخص کو اپنے کو کسی دین کا پیرو کہلانا ہے اور اس دین کی سوسائٹی میں رہنا ہے تو اس کو لازماً اسی دین کے قوانین ماننے پڑینگے اور ان قوانین کی تشریح اور ان کا نفاذ صرف وہی لوگ کرینگے جو دینی قانون کے ماہر ہونگے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ رہیں تو اسلامی سوسائٹی میں اور اسلامی معاملات میں چلائیں اپنی!

ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ آپ پاکستان میں رہتے ہوئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ پاکستان کی عدالتوں کے فیصلے اس بنا پر نہیں مانیں گے کہ یہ عدالتیں کبھی کبھی غلط فیصلے بھی دیتی رہی ہیں۔ اگر آپ کو پاکستان کا شہری بن کر رہنا ہے تو آپ کو لازماً پاکستان کی عدالتوں کے فیصلے ماننے ہیں، چاہے وہ فیصلے صحیح ہوں یا کبھی کبھی غلط بھی۔ بعینہٖ ویسی ہی پوزیشن ہے مذہبی قانون کی۔ اگر آپ کسی مذہب سے وابستہ ہیں تو آپ کو اس مذہب کا قانون ماننا پڑے گا اور اس

قانون کو سمجھنے اور نافذ کرنے کا حق ان کو حاصل ہوگا جو اس قانون کے ماہر ہونگے۔

آپ عدالتوں میں کن لوگوں کو رکھتے ہیں؛ ان ہی لوگوں کو جو قانون کے ماہر ہوتے ہیں۔ اور جو قانون کو پڑھتے اور سمجھتے رہتے ہیں۔ اسی طرح دینی معاملات میں بھی فیصلہ دینے کے اہل وہ لوگ ہیں جو دین کو جانتے ہیں؛"

(روزنامہ جنگ۔ بابت ۲۷)

اور آخر میں لکھا ہے کہ۔

"اصول یہ ہے کہ جس طرح دنیوی معاملات کے بارے میں فیصلہ دینے کا حق عدالتوں کو حاصل ہے اسی طرح دینی معاملات کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق علماء دین کو حاصل ہے۔ آپ ان کے اس حق کو چیلنج نہیں کر سکتے۔

اس مقالہ کے لکھنے والے ہیں پیر علی محمد راشدی۔ راشدی صاحب کا شمار بہر حال ملک کے لکھے پڑھے حضرات میں ہوتا ہے۔ وہ ممالک غیر میں پاکستان کے سفیر بھی رہ چکے ہیں۔ اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ ملک کا کس قسم کا طبقہ اس بنیادی غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ طلوع اسلام اپنے یوم تاسیس سے آج تک اس موضوع پر مسلسل اور متواتر لکھتا چلا آ رہا ہے۔ لیکن زیر نظر مقالہ سے اندازہ ہوا کہ اس پر بار بار لکھنے کی ضرورت ہے۔ اسی ضرورت کا احساس ان سطور کی تسوید کا محرک ہے۔

(٠)

راشدی صاحب نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے سیکولر اسٹیٹ میں کیفیت بیشک یہی ہوتی ہے۔ انہوں نے یورپ کی (یا عیسائی مذہب کے پیروں) کی جو مثال دی ہے خود اس سے یہ حقیقت واضح ہے کہ ان کے ذہن میں سیکولر اسٹیٹ کا تصور ہے۔ سیکولر اسٹیٹ میں' دین اور دنیا' دو الگ الگ حصوں میں منقسم ہوتے ہیں۔ دنیاوی معاملات کے فیصلے' مملکت کی طرف سے ہوتے ہیں اور مذہبی امور کے فیصلے مذہب کے علماء کی طرف سے۔ مسلمانوں میں' جب' صدر اول کے بعد' ملوکیت آگئی تو دین اور سیاست کی یہی ثنویت ان کا بھی معمول بن گئی۔ یعنی ان کے ہاں' مملکت اسلامی ہونے کے بجائے سیکولر ہوگئی جس میں خود قانون دو حصوں میں بٹ گیا۔ ایک حصہ پرسنل لاز (شخصی قوانین) پر مشتمل اور دوسرا حصہ' پبلک لاز' مدنی امور سے متعلق۔ پرسنل لاز میں دائرۂ اقتدار' علماء کا تسلیم کر لیا گیا اور پبلک لاز' مملکت کے حیطۂ اقتدار میں رہے۔ یہی انداز مملکت و سیاست مسلمانوں کے ہاں آج تک چلا آ رہا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ انداز ہی سرے سے غیر اسلامی ہے۔ نہ قرآن کریم میں کہیں زندگی کو دین اور دنیا کے دو الگ الگ شعبوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور نہ ہی عہد رسالتمآب اور خلافت راشدہ میں اس قسم کی تقسیم و تفریق کا کوئی نشان تک دکھائی دیتا ہے۔ اس میں آپ نے کہیں یہ نہیں دیکھا ہوگا کہ دنیاوی امور کے فیصلے تو

مملکت کی طرف سے نافذ ہوتے ہوں اور دینی معاملات کے لئے علماء کیطرف رجوع کیا جاتا ہو۔ اس دور میں علماء کا کوئی الگ وجود ہی نہیں تھا۔ اس وقت تو نماز کی امامت بھی عمالِ حکومت کی ذمہ داری تھی اور جمعہ کا خطبہ امیرالمومنین یا گورنر دیا کرتے تھے۔ اس وقت "حکومت کے فیصلے" اور "علماء کے فتاویٰ" کی الگ الگ اصطلاحات بھی وجود میں نہیں آئی تھیں جتنے کہ اس زمانے میں تعبدی (یعنی وہ معاملات جن کا تعلق "عبادت" سے ہو) اور غیر تعبدی امور کی تفریق بھی کسی کے ذہن میں نہیں تھی۔ اس وقت "عبادت" سے مراد تھی احکام و قوانینِ خداوندی کی اطاعت۔ خواہ ان کا تعلق صوم و صلوٰۃ سے ہو اور خواہ کاروباری معاملات سے۔ اور ان تمام احکام و قوانین کا نفاذ حکومت کیطرف سے ہوتا تھا اور وہی اختلافی معاملات میں فیصلے دیتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں نہ اعتقادی اور فقہی اختلافات پیدا ہوتے تھے اور نہ ہی مذہبی فرقوں کا وجود تھا۔ (فرقہ بندی کو تو قرآن نے شرک قرار دیا ہے' اس لئے اسلامی نظامِ زندگی میں فرقے پیدا کیسے ہو سکتے تھے؟)۔ جب احکام و قوانین کے نفاذ کا مرکز ایک ہو اور ان احکام و قوانین کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں ہوتا ہو' تو پھر باہمی اختلافات کا کیا سوال اور مذہبی فرقوں کا کیا تصور؟ اسلام' دین تھا' اور دین میں نہ کسی قسم کا تفرقہ پیدا ہو سکتا ہے' نہ کوئی گروہ بندی وجود میں آ سکتی ہے۔

یہ تھا نقشہ اسلامی مملکت کا۔ اس کے بعد (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) جب' اسلامی مملکت کی جگہ' مسلمانوں کی سیکولر اسٹیٹ نے لے لی' تو مذہب اور سیاست دو الگ الگ اور ناقابلِ اتصال' شعبوں میں بٹ گئے۔ اس وقت مذہبی پیشواؤں کا گروہ بھی پیدا ہو گیا اور مذہبی امور کے فیصلوں کے لئے ان کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت بھی لاحق ہو گئی۔ چونکہ پاکستان میں بھی حکومت سیکولر چلی آ رہی ہے اسلئے اس میں دنیاوی اور مذہبی امور کی ثنویت اور تفریق بھی موجود ہے' اور علماء کا الگ گروہ بھی۔

یہاں تک صورتِ حال قابلِ فہم ہے۔ لیکن ہماری غلط فہمی کی بنیاد یہ ہے کہ ہم نے سمجھ رکھا ہے کہ اسلامی مملکت میں بھی کیفیت یہی ہو گی۔ یہ تصور غلط ہے۔ سیکولر اسٹیٹ اور اسلامی مملکت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اسلامی مملکت میں' زندگی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت قرار پاتی ہے جس میں دنیاوی معاملات اور دینی معاملات الگ الگ نہیں ہوتے اس میں دنیا کا ہر معاملہ جو احکامِ خداوندی کے مطابق طے پائے' دینی قرار پاتا ہے۔ اسلئے اس میں' زندگی کے ہر معاملہ کے متعلق فیصلہ کن اتھارٹی حکومت ہی ہوتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ایسی حکومت کی مشینری اُنہی اربابِ علم و بصیرت اور اعیانِ فکر و نظر پر مشتمل ہو گی جو دنیاوی امور پر بھی گہری نگاہ رکھتے ہوں اور یہ بھی جانتے ہوں کہ خدا کی عطا کردہ راہ نمائی میں ان کے فیصلے کس طرح کئے جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے لوگ صحیح نظامِ تعلیم پیدا کر سکیگا۔ اس وقت ہمارا نظامِ تعلیم بھی سیکولر ہے۔ اس میں دنیاوی تعلیم سکولوں اور کالجوں میں دی جاتی ہے اور "دینی" تعلیم مکتبوں

اور دارالعلوموں میں ۔ اس وقت سکالرز اور ہوتے ہیں اور علماء اور ۔ قانون دان (وکلاء) اور ہوتے ہیں اور مفتیانِ شرعِ مبین " اور ۔ عدالت کا فیصلہ اور ہوتا ہے اور فتویٰ اور ۔ اسلامی نظامِ مملکت و معاشرت میں اس قسم کی کوئی تفریق نہیں ہوگی۔ اس میں ایک ہی درس گاہ ہوگی جس میں دنیاوی علوم اور دینی تصورات کو بیک وقت سامنے لایا جائے گا جس میں یہ بتایا جائے گا کہ عصرِ حاضر کے تقاضوں کا حل، قرآن کریم کی روشنی میں کیا ہوگا۔ عام درسگاہوں کے بعد خاص درسگاہوں میں قانون کی تعلیم دی جائے گی ۔ اس میں بتایا جائے گا کہ مختلف زمانوں میں ہمارے فقہاء نے قانون سازی کے سلسلہ میں کیا کیا کوششیں کیں اور ہم اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، قرآن کریم کے ابدی اور غیر متبدل اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے قوانین و ضوابط کس طرح مرتب کر سکتے ہیں۔ اس قسم کے قانون دان (فارغ التحصیل طلباء) آگے چل کر قوانین ساز بھی ہونگے اور حکومت کے مشیر بھی۔ ریسرچ اسکالرز بھی ہونگے اور عدلیہ کے سربراہ بھی ۔ اس وقت نہ علماء کرام اور مفتیانِ عظام کا الگ وجود ہوگا، نہ اُن کے فتووں کی کوئی ضرورت ۔ اس وقت ہر معاملہ کا فیصلہ حکومت کی طرف سے ہوگا اور مملکت کے قانون کی حیثیت سے نافذ العمل۔ اس وقت نہ الگ ائمہ مساجد ہونگے نہ جداگانہ خطیب ۔ نہ انفرادی واعظ ہونگے نہ پیشہ ور مبلغ ۔ یہ سب کچھ اسلامی معاشرہ کی طرف سے ہوگا جس کا دوسرا نام اسلامی مملکت یا حکومتِ خداوندی ہے ۔ اس حکومت کے فیصلوں (قوانینِ مملکت) کی پابندی لازمی ہوگی اور ان کی خلاف ورزی جرم جو مستوجبِ سزا ہوگا۔ اس وقت نہ کوئی کسی پر کفر کا فتویٰ لگا سکیگا، نہ کسی کو اپنے طور پر اپنے مسلمان ہونے کی سند پیش کرنے کی ضرورت ہوگی اس وقت، اسلامی حکومت یہ طے کریگی کہ مسلم کسے تسلیم کیا جائے گا اور غیر مسلم کسے، اس لئے کہ ان دونوں میں امتیاز، اکثر امورِ مملکت کے سلسلہ میں ضروری ہوگا۔

یہ تھا نقشہ عہدِ رسالتمآبؐ اور خلافتِ راشدہ کی اسلامی مملکتوں کا، اور یہی نقشہ ہوگا اس اسلامی مملکت کا جو جب اور جہاں بھی قائم ہوگی۔ پاکستان اسی قسم کی مملکت کے قیام کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔ تحریکِ پاکستان میں یہی بنیادی وجہ نزاع تھی۔ آزاد ہندوستان میں (انگریزی عملداری کی طرح) سیکولر حکومت قائم کی جانی تھی اور جن اربابِ بصیرت کی نگاہ اسلامی تقاضوں پر تھی، ان کے نزدیک، اس حکومت میں مسلمان، اسلامی زندگی بسر نہیں کر سکتا تھا۔ اسی لئے وہ ایک الگ، آزاد مملکت کا تقاضا کرتے تھے جو (سیکولر کی بجائے) اسلامی خطوط پر متشکل ہو۔ وہاں علماء کی اکثریت، تحریکِ پاکستان کی مخالف تھی۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ سیکولر حکومت میں (شخصی قوانین کے دائرے تک ہی سہی) ان کا اقتدار قائم رہے گا اور اسلامی حکومت میں ان کا جداگانہ وجود ہی ختم ہو جائے گا۔ پاکستان وجود میں آگیا لیکن یہاں بھی علماء حضرات نے (اپنے اقتدار اور وقار کی خاطر) اسلامی حکومت کا صحیح نقشہ سامنے نہیں آنے دیا۔ وہ یہاں تھیاکریسی انداز کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں ۔

جو اپنے نتائج کے اعتبار سے سیکولر حکومت سے بھی بدتر ہوتی ہے۔ اس میں 'مذہبی پیشوائیت' ہیئتِ حاکمیہ کی پوزیشن اختیار کر لیتی ہے اور ہر معاملہ میں اقتدارِ اعلیٰ اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہے۔ اس مقصد کے لئے ان کی ٹیکنیک یہ ہے کہ وہ علماء کو "انبیاء بنی اسرائیل" کا درجہ دیتے اور منبرِ رسول اللہ کا وارث ٹھہراتے ہیں۔ اپنی ہستی کو لاینفک قرار دینے کے لئے وہ اس قسم کے دلائل دیتے رہتے ہیں (جنہیں راشدی صاحب نے بھی اپنے مضمون میں دہرایا ہے)۔

"بات سیدھی ہے۔ آپ بیمار ہوتے ہیں تو حکیم یا ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں۔ آپ کو مکان بنانا ہوتا ہے تو معمار کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔ مشینری کا معاملہ ہوتا ہے تو مکینیکل انجینئر بلاتے ہیں۔ ہوائی جہاز چلانا ہوتا ہے تو پائلٹ کا انتظام کرتے ہیں۔ حجامت کروانی ہوتی ہے تو باربر شاپ سے استفادہ کرتے ہیں۔ سبزی گوشت خریدنا ہوتا ہے تو مارکیٹ جاتے ہیں۔

اب اگر اسلام کے بارے میں کوئی مسئلہ درپیش ہو تو آپ کس کی طرف دیکھیں گے؟ کس کی رائے آپ حاصل کریں گے؟ انہیں لوگوں سے جو اسلام جانتے ہوں یا کسی اور سے؟"

یہ (سطحی سی) دلیل اس قدر نگاہ فریب اور مغالطہ آفریں ہے کہ اچھے اچھے ذہن بھی اس سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ اور کہنے لگ جاتے ہیں کہ ہاں صاحب! دینی معاملات کا فیصلہ علماء کرام ہی کو کرنا ہوگا۔ ایسا کہتے وقت وہ بھول جاتے ہیں کہ سیکولر حکومت میں تو یہ تقسیم موجود ہوتی ہے لیکن اسلامی حکومت میں یہ نظریہ بالکل باطل ہے۔ اس میں ڈاکٹر، وکلاء، انجینئر، پائلیٹ وغیرہ حکومت کے مشیر ہوتے ہیں، فیصلہ کن اتھارٹی نہیں ہوتے۔ اس میں انجینئر یہ مشورہ تو دیتے ہیں کہ فلاں مقام پر فلاں قسم کا پُل زیادہ مضبوط رہے گا۔ اس امر کا فیصلہ حکومت ہی کرتی ہے کہ پُل کس جگہ بنانا چاہیئے اور کس قسم کا۔ اس میں ایک وکیل یہ تو بتا سکتا ہے کہ فلاں معاملہ میں قانون کیا کہتا ہے۔ قانون بنانا یا قانون کے مطابق فیصلہ دینا، وکیل کا کام نہیں ہوتا۔ یہ اختیارات حکومت ہی کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح، اسلامی حکومت میں علوم دین سے واقف حضرات، حکومت کے مشیر یا اس کی طرف سے متعین کردہ عمال ہوں گے۔ فیصلہ کن اتھارٹی کے حامل نہیں ہوں گے۔ فیصلہ کا اختیار حکومت ہی کو ہوگا۔

یہ ہے فرق اسلامی حکومت اور سیکولر حکومت میں علماء کی پوزیشن میں۔ اور اسی فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کا نتیجہ وہ غلط فہمی ہے جس کا (عوام تو ایک طرف) ہمارے خواص بھی بُری طرح شکار ہیں اور اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ ہمارا نوجوان طبقہ یہاں تک کہنے پر اتر آیا ہے کہ اس قسم کی تھیاکریسی کے مقابلہ میں سیکولرازم ہزار درجہ بہتر ہے۔ ہم ان نوجوانوں کو کوسنے تو لگ جاتے ہیں لیکن یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ ان کے دلوں میں اس قسم کے خیالات پیدا کرنے کا موجب خود ہم ہی ہیں جو یہ تصور عام کر رہے ہیں کہ اسلامی حکومت میں "دین کے معاملات میں اقتدارِ اعلیٰ علماء کو حاصل ہوگا۔ جب تک ہم اس یکسر غیر اسلامی تصور کو مٹاتے نہیں، تو موجودہ کشمکش دور

ہو سکتا ہے نہ کوئی ضابطہ قوانین مرتب ہو سکتا ہے اور نہ ہی کوئی پائیدار حکومت قائم ہو سکتی ہے۔ علماء کا طبقہ اپنا اقتدار قائم رکھنا چاہتا ہے اور ہم (شعوری یا غیر شعوری طور پر) انہیں اہمیت دے دے کر ان کی گرہیں اور مضبوط کئے چلے جاتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک غلط فہمی اور بھی لاحق ہوتی ہے۔ سمجھا یہ جاتا ہے کہ دینی معاملات کے متعلق احکام پہلے سے مرتب شدہ رکھے ہیں اور علماء کو ان کا علم ہوتا ہے۔ اس لئے جس معاملہ کے متعلق ہمیں معلوم کرنا ہو کہ شریعت کا حکم کیا ہے اس کے لئے ہمیں لامحالہ علماء کی طرف رجوع کرنا ہوگا کیونکہ وہی جانتے ہیں کہ اس باب میں شریعت کا حکم کیا ہے۔ یہ کیفیت بھی سیکولر حکومت میں ہوتی ہے جس کا کام دنیاوی امور سے متعلق احکام وقوانین وضع کرنا ہوتا ہے۔ دینی امور کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان سے متعلق تمام احکام پہلے سے طے شدہ ہیں۔ اسلامی حکومت میں کیفیت یہ نہیں ہوتی۔ قرآن کریم میں (چند احکام کو چھوڑ کر) ابدی اور غیر متبدل اصول دیئے گئے ہیں۔ اسلامی حکومت کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق جزئی احکام خود مرتب کرے۔ انہیں احکام شریعت کہا جائے گا۔ قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے اور ان کی روشنی میں مرتب کردہ احکام عند الضرورت، بدلتے رہیں گے۔ اس سے واضح ہے کہ اسلامی حکومت میں یہ معلوم کرنے کے لئے کہ فلاں معاملہ میں شریعت کا فیصلہ کیا ہے، حکومت کی طرف سے شائع کردہ ضوابط قوانین کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ جن حضرات کو ان ضوابط پر زیادہ عبور ہوگا انہیں قانون دان کہا جائے گا۔ لہٰذا، اسلامی حکومت میں اس مقصد کے لئے بھی موجودہ تصور کے علماء کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔

(۰)

اسی ضمن میں ایک سوال اور بھی سامنے لایا جاتا ہے جس کی وضاحت ضروری ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر (نیکیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنے) کا فریضہ تو بہرحال ایسا ہے جس کی ادائیگی علماء کرام ہی کریں گے۔ اس لئے اس مقصد کے لئے تو علماء حضرات کی ضرورت باقی رہے گی۔ اس موضوع پر ہم اس سے پہلے بھی لکھ چکے ہیں، لیکن تجدید یادداشت کے لئے اسکا اس مقام پر دہرا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

اسلام نام ہے اس طریق یا نظام کا جس کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسان کو اس دنیا کی سرفرازیاں اور خوشگواریاں بھی حاصل ہو جاتی ہیں اور وہ مرنے کے بعد زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل

بھی ہوجاتا ہے۔ یہ طریقِ زندگی تمام نوعِ انسان کے لئے خدا کی طرف سے تجویز کردہ ہے اور ہمیشہ کے لئے نافذ العمل رہنے کے لئے دیا گیا ہے۔ نہ اسلام کے سوا کوئی اور طریقِ زندگی اس عظیم مقصد کو پورا کر سکتا ہے اور نہ ہی اس میں کسی تغیر و تبدیل یا حک و اضافہ کی ضرورت لاحق ہو سکتی ہے۔ یہ انسانیت کے لئے خدا کی طرف سے مکمل اور آخری نظامِ حیات ہے۔ وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ۔ (جو کوئی اسلام کے سوا کوئی اور طریقِ زندگی اختیار کریگا تو وہ اس سے قبول نہیں کیا جائیگا۔ (3/85) سے یہی مراد ہے۔

تمام نوعِ انسان کی طرف رسول

نبی اکرمؐ نے اسی اسلام کی دعوت تمام نوعِ انسان کو دی۔ یعنی یہ دین نہ قومی تھا نہ خاندانی۔ نہ نسلی تھا نہ وطنی۔ بلکہ ان کی دعوت خون، نسل، رنگ، قوم، زبان، وطن کی حدود و قیود سے ماوراء پوری کی پوری نوعِ انسان کے لئے تھی۔ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا۔ (7/158) "تم پوری نوعِ انسان سے پکار کر کہہ دو کہ میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔" یہ دعوت نہایت حکیمانہ اور حسن کارانہ انداز سے دی جاتی تھی۔ اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ۔ (16/125)۔ اور علم و بصیرت اور دلائل و براہین پر مبنی ہوتی تھی۔ أَدْعُوا إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي۔ (12/108) جو لوگ اس طرح دل اور دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ اس دعوت کو قبول کر لیتے تھے، وہ اس جماعت کے افراد بن جاتے تھے جو اپنی زندگی اسلام کے مطابق بسر کرنے کے لئے وجود میں آتی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب اسلام ایک نظامِ زندگی کا نام ہے، تو جو لوگ (جماعتِ مومنین) اس نظام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا عہد کرتے تھے ان پر کچھ پابندیاں عاید ہوتی تھیں۔

معروف و منکر

یعنی یہ کہ انہیں فلاں فلاں کام ضروری کرنے ہیں اور فلاں فلاں باتوں سے رکنا اور بچنا ہے۔ ان لوگوں کے لئے جن امور کا سرانجام دینا ضروری تھا، قرآنِ کریم نے انہیں "معروف" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے ــــ یعنی وہ باتیں جنہیں وہ نظام صحیح تسلیم (RECOGNISE) کرتا ہے ــــ اور جن باتوں سے بچنا ضروری تھا وہ انہیں "منکر" کہہ کر پکارتا ہے ــــ یعنی ایسی باتیں جو اس نظام کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔

نظام کے تابع زندگی بسر کرنے کا عملی مفہوم یہ ہے کہ اس بات کو افراد کی مرضی پر نہیں چھوڑ دیا جاتا کہ وہ جس طرح جی چاہے "معروف" پر عمل کریں اور "منکر" سے رکیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اسے متعین کیا جائے کہ "معروف" کیا ہے اور "منکر" کیا۔ اور "معروف" پر عمل کرنے کی شکل کیا ہوگی اور "منکر" سے رکنے کا طریق کیا۔ بالفاظِ دیگر، یہ سب کچھ نظم و نسق کے تابع ہوگا۔ اس نظم و ضبط کو، دورِ حاضر کی اصطلاح میں نظامِ مملکت کہتے ہیں۔ لہذا دین اس نظامِ مملکت کا نام ہے جس میں افراد و مملکت کو اسلام کے مطابق چلایا جاتا ہے۔ یعنی

انہیں "معروف" کے مطابق عمل کرنے کا حکم دیا جاتا ہے اور منکرات روکا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اس کے لئے "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ یہ اصطلاح اصولی طور پر آئی ہے۔ یعنی معروف اور منکر کی تفصیلات قرآن نے خود مرتب نہیں کر دیں۔ اسے اسلامی حکومت پر چھوڑا ہے کہ وہ قرآن کریم کے اصولات اقدار اور احکام کی روشنی میں معروف اور منکر کی جزئیات اور تفصیلات خود متعین کرے۔

آگے بڑھنے سے پہلے دو تین باتوں کا دہرا لینا ضروری ہے جو تصریحات بالا سے مستنبط ہوتی ہیں۔ یعنی

(۱) اسلام کیطرف دعوت، تمام نوعِ انسان کو دی جائے گی۔ یہ صرف "دعوت" ہوگی، حکم نہیں ہوگا۔ بالفاظ دیگر، اسلام کو لوگوں تک پہنچا دیا جائے گا اور اسے ان کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے گا کہ وہ چاہے اسے اختیار کرلیں، چاہے اس سے انکار کر دیں۔

(۲) جو لوگ بطیب خاطر، دل اور دماغ کی پوری رضامندی کے ساتھ، اس دعوت کو حق سمجھ کر اختیار کرلینگے، وہ جماعتِ مومنین کے افراد بن جائینگے۔

(۳) یہ جماعت ایک نظامِ مملکت کے تابع زندگی بسر کریگی جو انہیں "معروف" کے مطابق چلنے اور "منکر" سے رُکنے کے لئے ضروری احکام نافذ کریگا۔

نظم و ضبط اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ ان احکام سے یہ مطلب نہیں کہ وہ نظامِ مملکت افراد کی زندگی کو قدم قدم پر قانون کی زنجیروں میں جکڑ دیگا۔ چونکہ یہ جماعت وہ ہوگی جس نے اچھی طرح سے سمجھ سوچ کر، قلب اور دماغ کے پورے اطمینان کے ساتھ، اس طریق زندگی کو اختیار کیا ہوگا۔ اس لئے معروف کے اتباع اور منکر سے اجتناب کا جذبہ ان کے دل کی گہرائیوں سے ابھریگا۔ حتیٰ کہ رفتہ رفتہ ان کی کیفیت یہ ہو جائے گی کہ ان کا ہر قدم، بلا تکلف و بلا تامل، از خود، معروف کے مطابق اٹھے گا اور منکر سے رُکے گا۔ اس طریقِ زندگی کا منتہیٰ و مقصود ہی یہ ہے کہ وہ انسانی سیرت و کردار کو اُس سانچے میں ڈھال دے جسے خدا نے انسانوں کے لئے تجویز کیا ہے۔ یہ مقصد صحیح تعلیم و تربیت سے حاصل ہوتا ہے جو اس مملکت کا بنیادی فریضہ ہوتا ہے۔ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" درحقیقت معاشرہ میں نظم و ضبط کے لئے ہوگا۔

(۰)

اب آگے بڑھیے۔

حضورؐ کا فریضہ جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، نبی اکرمؐ کا ایک فریضہ یہ تھا کہ نوعِ انسان کو اسلام کی دعوت دی جائے۔ اس اعتبار سے حضورؐ داعی الی اللہ (۳۳/۴۶) اور اولین مبلغ اسلام تھے (۵/۶۷)۔ لیکن اس کے ساتھ ہی حضورؐ کا فریضہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر بھی تھا۔ یَاْمُرُھُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھٰھُمْ

عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (۲۲/۴۱) پہلا فریضہ عام انسانوں (غیر مسلموں) کو اسلام کی دعوت دینے کا تھا۔ دوسرا فریضہ اسلامی مملکت میں، معروف، کو حکماً نافذ کرنے اور منکر سے حکماً روکنے کا۔

نبی اکرمؐ کے بعد یہ دونوں فرائض امت کی طرف منتقل ہو گئے۔ یعنی غیر مسلموں کو اسلام کی طرف دعوت دینا، اور اسلامی مملکت میں "امر بالمعروف و نہی عن المنکر"۔ (چونکہ اس وقت ہمارے پیشِ نظر موضوع ـــــ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ـــــ ہے اس لئے ہم سردست پہلے فریضہ (تبلیغ و دعوت) کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتے)

امت کا فریضہ

اس فریضہ کے متعلق کہا گیا۔ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ۔ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۔ (۲۲/۴۱) یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں حکومت ملے گی تو یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کریں گے۔ معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے۔ اور ان کے تمام کام، انجام کار اللہ کیلئے ہونگے۔

اس سے ظاہر ہے کہ اسلامی مملکت کا فریضہ

(۱) اقامتِ صلوٰۃ،

(۲) ایتائے زکوٰۃ،

(۳) امر بالمعروف۔ اور

(۴) نہی عن المنکر

ہوگا۔ (اس وقت ہم اس بحث میں نہیں جانا چاہتے کہ قرآن کریم کی رو سے "اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کیلئے بھی تمکن فی الارض (اسلامی حکومت) ضروری ہے۔ اس وقت صرف اتنا دیکھئے کہ اسلامی مملکت کا فریضہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ اور چونکہ اسلامی حکومت پوری کی پوری) امت کی ہوتی ہے (وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ۔ ان کی حکومت باہمی مشاورت سے ہوتی ہے) نہ کہ کسی خاص فرد یا گروہ کی، اس لئے اس فریضہ کو پوری امت ادا کرتی ہے۔ ان کی کوئی خاص جماعت نہیں۔ چنانچہ قرآن کریم نے دیگر مقامات پر اس کی واضح الفاظ میں تصریح کر دی ہے۔ سورۃ آل عمران میں ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ۔ (۳/۱۰۹)

تم ایک بہترین قوم ہو جسے تمام نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے کھڑا کیا گیا ہے۔ تم معروف کا حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو (اس لئے کہ) تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اس سے واضح ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ پوری کی پوری امت کا ہے۔ سورۂ توبہ میں ہے۔ وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ..... (۹/۷۱) مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق اور مددگار ہیں۔ یہ معروف کا حکم دیتے ہیں اور منکر سے روکتے ہیں۔

اس سے بھی واضح ہے کہ یہ فریضہ پوری امت کا ہے، کسی خاص گروہ کا نہیں۔ حتیٰ کہ اس میں مومن عورتیں بھی مردوں کے ساتھ برابر کی شریک ہیں۔ اسی سورہ میں ذرا آگے چل کر، عام مومنین کی صفات بیان کی گئی ہیں اور اس ضمن میں کہا گیا ہے۔ اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (۹/۱۱۲) "وہ معروف کا حکم دینے والے اور منکر سے روکنے والے ہیں"۔

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ

(۱) امر بالمعروف و نہی عن المنکر تمام امتِ مسلمہ کا فریضہ ہے۔

(۲) یہ امت اس فریضہ کو حکومت کے ذریعے سر انجام دیتی ہے۔ حکم (امر) ایک حکومت ہی دے سکتی ہے۔ اور حکومت ہی کسی کو غلط باتوں سے روک سکتی ہے۔ "روکنے" کے لئے قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

قرنِ اول میں

اسلام کے قرنِ اول میں جب دین اپنی حقیقی شکل میں قائم تھا، اسلامی حکومت اس فریضہ کو انجام دیتی تھی، اور چونکہ یہ حکومت ساری امت کی صحیح نمائندہ ہوتی تھی اس لئے درحقیقت خود امت اس فریضہ کو سر انجام دیتی تھی۔ نہ اس کے لئے کوئی الگ جماعت تھی اور نہ ہی غیر مسلموں تک اسلام پہنچانے (تبلیغ) کے لئے کوئی خاص گروہ۔ یہ فریضہ بھی ہر مسلمان سر انجام دیتا تھا اور اسکے لئے اس کے پاس سب سے زیادہ مؤثر ذریعہ خود اس کی سیرت و کردار تھا۔ غیر مسلموں کے ساتھ اس کا حسنِ معاملہ، اسکے دین کی صداقت کی محکم دلیل اور زندہ شہادت تھی۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، اس زمانے میں امت میں کوئی گروہ ایسا نہیں تھا جس کے ذمے "امور مذہبی" کی سر انجام دہی ہو۔ اس وقت امت "مذہب" کے لفظ تک سے آشنا نہیں تھی۔ ان کے پاس "دین" تھا جس میں مذہبی اور سیاسی امور کی تفریق ہی نہیں ہوتی۔

اس کے بعد جب ہمارے ہاں (دین کا نظام گم ہو جانے سے) مذہب اور سیاست کی ثنویت عمل میں آئی تو امور مملکت، حکمران طبقہ نے اپنی تفویض میں لے لئے اور مذہبی امور کے لئے ایک الگ گروہ وجود میں آگیا۔ چونکہ ان کے پاس حکومت کا اقتدار نہیں تھا، اس لئے ان کے نزدیک "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کا مفہوم اتنا ہی رہ گیا کہ لوگوں کو وعظ و نصیحت کے ذریعے، اچھے کام کرنے کی تلقین کی جائے اور بُرے کاموں سے بچنے کی تاکید۔ اس طرح ایک طرف حکومت ایک خاص طبقہ کی ملکیت بن گئی اور دوسری طرف "امر بالمعروف و نہی

عن المنکر کا واعظانہ فریضہ بھی ایک خاص گروہ کے اندر محدود ہو گیا۔ امت نہ اُس میں شریک رہی، نہ اس میں۔ ایوانِ حکومت میں حکمران طبقہ اپنے آپ کو "ہم" اور امت کو "تم" کہہ کر پکارتا تھا۔ اور مسجد میں واعظ اور خطیب بھی کچھ کرتا تھا۔ یعنی امت الگ تھی اور یہ دونوں گروہ الگ اور امت سے بالا۔ یہی کیفیت آج تک چلی آ رہی ہے کیونکہ اس کے بعد دین کا نظام (جسے خلافت علیٰ منہاج نبوت کہا جاتا ہے) پھر قائم نہیں ہوا۔

یہاں تک بات بالکل واضح اور صاف ہے۔ لیکن حیرت اس وقت ہوتی ہے جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کے فریضہ کی سرانجام دہی کے لئے ایک الگ گروہ کے جواز بلکہ وجوب کے لئے خود قرآنِ کریم ہی کی ایک آیت سے سند پیش کی جاتی ہے۔ وہ سورۂ آلِ عمران کی حسب ذیل آیت ہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ
يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ - (٣/١٠٣)

اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے۔

اور چاہیئے کہ تم میں ایک ایسی جماعت ہے جو نیک کاموں کی طرف بلاتی ہے اور
حکم کرتی ہے اچھے کاموں کا اور منع کرے برائی سے۔ یہی لوگ اپنی مراد کو پہنچنے والے ہیں۔

قرآنِ کریم کا دعویٰ یہ ہے کہ اس میں کہیں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اس حقیقت کو اس نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی دلیل بتایا ہے۔ آپ ان تمام آیات پر ایک دفعہ پھر نگاہ ڈالئے جن میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو پوری کی پوری امت کا فریضہ بتایا ہے (اور جنہیں پہلے درج کیا گیا ہے)۔ اور اس کے بعد سوچیے کہ اگر اس آیت (٣/١٠٣) کا یہی مطلب لیا جائے (کہ یہ فریضہ پوری امت کا نہیں بلکہ امت کے ایک خاص گروہ کا ہے) تو اس سے بڑی اختلافی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ یعنی ایک طرف تو قرآن بار بار کہتا ہے کہ یہ فریضہ پوری امت کا ہے اور ایک آیت میں یہ کہہ دیتا ہے کہ یہ فریضہ پوری امت کا نہیں، امت کے ایک خاص گروہ کا ہے! قرآنِ کریم کے دیگر مقامات کو چھوڑیئے اسی سورۂ آلِ عمران کے اسی رکوع میں جس میں آیت (٣/١٠٣) آئی ہے، پانچ آیتوں کے بعد وہ آیت موجود ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ
عَنِ الْمُنْكَرِ ... (٣/١٠٩)

تم بہترین امت ہو جسے نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے کھڑا کیا گیا ہے۔ تم معروف کا
حکم دیتے ہو اور منکر سے روکتے ہو۔

کیا آپ اس کا تصور بھی کر سکتے ہیں کہ قرآنِ کریم پہلے یہ حکم دیتا ہو کہ تم میں ایک گروہ ایسا رہنا چاہیئے جو امر بالمعروف

اور نہی عن المنکر کرے۔ اور پھر پانچ ہی آیات بعد یہ کہے کہ نہیں! یہ فریضہ تم میں سے کسی ایک گروہ کا نہیں، ساری کی ساری امت کا ہے۔ اور پھر متعدد مقامات پر اس دوسری آیت کی تائید کرتا جائے۔ یہ ہو نہیں سکتا۔ پہلی آیت (۳/۱۰۴) کا مطلب، دیگر آیات کے مطابق ہی ہونا چاہیئے اور ان کے مطابق ہی ہے۔ اس میں غلط فہمی "مِنکُم" سے پیدا ہوتی ہے۔ (مِنْ + کُمْ) جس کا ترجمہ کیا جاتا ہے "تم میں سے"۔ اس کا یہ ترجمہ صحیح نہیں۔ عربی زبان میں (مِنْ) "میں سے" کے معنوں میں بھی آتا ہے (اسے تبعیض کہتے ہیں۔ یعنی کل میں سے بعض)۔ جیسے قرآن کریم میں ہے۔ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ ..... (۲/۲۵۳)۔ یہ وہ رسول ہیں جنہیں ہم نے بعض سے بعض پر فضیلت دی ہے۔ ان میں وہ بھی ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا۔ یعنی ان میں سے بعض کی یہ خصوصیت تھی۔ یہ تبعیض کی مثال ہے۔

لیکن یہی "مِنْ" "پوری کی پوری جنس" کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ (اسے تبیین کہتے ہیں[1]) جیسے سورۂ بقرہ میں ہے وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ۔ (۲/۲۳۱) اس کے یہ معنی نہیں کہ اللہ نے "کتاب و حکمت میں سے جو نازل کیا ہے۔ اس کے معنی کتاب و حکمت ہیں۔ علامہ سیوطیؒ نے (الاتقان میں) اس کی اور مثالیں بھی دی ہیں۔ مثلاً يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ (۱۸/۳۱) اس کے معنی "سونے کے کڑے" ہیں۔

علاوہ بریں آیت (وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ .....) کے آخر میں ہے۔ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ "اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں"۔ اگر "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کے فریضہ کو ایک الگ گروہ کے ساتھ مختص کر دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآن کریم کی رو سے یہ خاص گروہ ہی فلاح پائے گا۔ باقی امت نہیں۔ یہ بدیہی طور پر غلط ہے۔ قرآن کریم نے فلاح و سعادت کی راہ کو تمام مومنین کے لئے کھلا رکھا ہے، نہ کہ ان میں سے کسی خاص جماعت کے لئے۔ فلاح و سعادت کو ایک خاص گروہ کے اندر محدود کر دینے کا تصور تو اسلامی تعلیم کو جڑ اور بنیاد سے اکھیڑ دیتا ہے۔ اس سے بھی واضح ہے کہ آیت (وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ...) سے مراد تمام جماعت مومنین ہے، اس میں سے کوئی الگ گروہ نہیں۔

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، "امور مذہبی اور تبلیغ اسلام" کے لئے ایک الگ مخصوص گروہ کا تصور اس وقت پیدا ہوا جب سیاست کو دین سے الگ کر لیا گیا۔ یعنی جب مملکت سیکولر (SECULAR) ہو گئی۔ اور ہر سیکولر اسٹیٹ میں امور مذہبی کے لئے الگ شعبہ (ECCLESIASTICAL DEPARTMENT) ہوتا ہے۔ اسلامی مملکت میں پوری کی پوری مملکت "امور مذہبی" کے لئے وقف ہوتی ہے۔ یعنی مملکت کا تمام کاروبار

---

[1] دیکھئے لغات القرآن۔ باب "من"۔

قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پاتا ہے، اس لئے وہ دینی ہو جاتا ہے۔ جب تک کسی مملکت میں "امورِ مذہبی" کے لئے ایک الگ گروہ مخصوص رہے گا وہ مملکت سیکولر رہے گی۔

تصریحات بالا سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے

(۱) امر بالمعروف و نہی عن المنکر، پوری کی پوری امت کا فریضہ ہے، امت میں کسی الگ گروہ کا نہیں۔

(۲) امت' اس فریضہ کو اپنی حکومت کے ذریعے سرانجام دیتی ہے۔ ان کی یہ حکومت اس انداز کی ہوتی ہے جس میں ہر فردِ امت' بالواسطہ یا بلاواسطہ شریک ہوتا ہے اور اس کا سارا کاروبار قرآنی حدود کے اندر سرانجام پاتا ہے۔

(۳) لہٰذا' اسلامی مملکت میں "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کے لئے بھی مذہبی پیشوائیت کی ضرورت نہیں۔

حادثۂ ارتحال

حکیم ذکی احمد خاں مالک جدید پریس بلی ماراں دہلی نے ۷ جولائی ۱۹۷۰ء کو بعارضہ ضیق النفس و خرابی گردہ ۷۴ سال کی عمر میں اس دار فانی سے رحلت کی۔ مرحوم ۱۹۱۷ء میں مدرسہ طبیہ دہلی سے فارغ التحصیل ہوئے اور سات سال حاذق الملک حکیم محمد اجمل خان صاحب کی پیشکاری میں رہ کر معالجات کا عملی تجربہ حاصل کیا۔ ۱۹۲۵ء میں جدید پریس کی بنیاد رکھی جو آج بہت بڑا آفسٹ پریس ہے۔ معالجات میں مرحوم کو ممتاز مقام حاصل تھا۔ علاج بالغذا میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ ہندوستان، پاکستان میں کثیر تعداد میں لوگ ان کے معالجات کے گرویدہ تھے۔ ان کی وفات سے جو خلاء پیدا ہوا وہ بظاہر پُر ہونا مشکل ہے۔ مرحوم کے پسماندگان میں ایک بیوہ، چار لڑکے چار لڑکیاں شامل ہیں۔ خداوند کریم مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائیں اور پسماندگان و اعزہ کو صبر جمیل!

غمگسار

حکیم شمس الرحمان خان برادر۔ ۱۱ مین بازار دھرم پورہ لاہور

ادارۂ طلوعِ اسلام اس حادثہ فاجعہ میں شریکِ غم ہے۔ حکیم صاحب مرحوم طلوعِ اسلام (قبل از تقسیم ہند) کے اولین ناشر اور پرنٹر تھے۔ خدا مرحوم کو غریق رحمت کرے!

طلوع اسلام کالج فنڈ

(بہ تسلسل فہرست مطبوعہ طلوع اسلام بابت جون ۱۹۷۰ء) حسب ذیل عطیات بہ تشکر موصول ہوئے۔

فہرست "ب" (عطیات برائے کالج فنڈ)

(۱)	محترم میاں خدا بخش صاحب	گجرات	۲۰۰ر۰۰ روپے
(۲)	" چوہدری فیض احمد صاحب	"	۵۰۰ر۰۰ "
(۳)	" بشیر احمد بٹ صاحب	"	۱۰۰ر۰۰ "
(۴)	" مرزا عطاء الرحمٰن صاحب	"	۳۰۰ر۰۰ "
(۵)	" چوہدری محمد حسین صاحب	"	۵۰ر۰۰ "
(۶)	" فضل علی صاحب	"	۵۰ر۰۰ "
(۷)	" سید حاکم شاہ صاحب	"	۵ر۰۰ "
(۸)	" ملک حبیب اللہ صاحب	"	۵ر۰۰ "
(۹)	میسرز احمد خان محمد شفیع صاحب	"	۱۰ر۰۰ "
(۱۰)	محترم محمد کمال صاحب	"	۲ر۰۰ "
(۱۱)	" ماسٹر محبوب الٰہی صاحب	"	۱ر۰۰ "
(۱۲)	" قلندر حسین شاہ صاحب	دیونہ منڈی (گجرات)	۲ر۰۰ "
(۱۳)	" محمد انور صاحب (پنشنر)	"	۱۰ر۰۰ "
(۱۴)	" ماسٹر محمد انور صاحب	"	۱۰ر۰۰ "
(۱۵)	" چوہدری محمد اکبر صاحب	"	۱۰ر۰۰ "
(۱۶)	" ڈاکٹر شفقت احمد صاحب	"	۱۰ر۰۰ "
(۱۷)	" صوبیدار فتح خان صاحب	"	۲۰ر۰۰ "
(۱۸)	" چوہدری نذیر حسین صاحب	"	۲۰ر۰۰ "
(۱۹)	" محمد اشرف بابر صاحب	"	۱۰ر۰۰ "
(۲۰)	" ملک اللہ دتہ صاحب	"	۱۰ر۰۰ "
(۲۱)	" عظمت اللہ خان صاحب	"	۵ر۰۰ "

(۲۲)	محترم چوہدری نذیر احمد صاحب	ہڑپہ والا (گجرات)	۲۰۰ر۰۰ روپے
(۲۳)	" مولانا یعقوب حسین صاحب	کابل	۲۰۰ر۰۰ "
(۲۴)	" ناصر حسین صاحب	کھوپال والا (سیالکوٹ)	۴۰ر۰۰ "
(۲۵)	محترمہ بیگم چوہدری تجمل صاحبہ	گجرات	۵۰۰ر۰۰ "
(۲۶)	محترم محمد مشتاق علی خان صاحب	ساہیوال	۱۰۱ر۰۰ "
(۲۷)	" سید عبدالرشید صاحب	لاہور	۵۰ر۰۰ "
(۲۸)	" ظہور الدین بھٹی صاحب	"	۱۰ر۰۰ "
(۲۹)	" محمد شریف میر صاحب	"	۱۰ر۰۰ "
(۳۰)	" محمد عبداللہ ارائیں صاحب	چک ۱۰۱/۴ ای۔بی (ملتان)	۲۰۰ر۰۰ "
(۳۱)	محترمہ الف بخش صاحبہ	بلفاسٹ	۳۶۳ر۲۸ "
(۳۲)	ضلع لائلپور کے ایک محترم دوست جو اپنا نام شائع نہیں کرانا چاہتے۔		۲۰۰ر۰۰ "
(۳۳)	محترم شمس تبریز صاحب	لاہور	۵ر۰۰ "
(۳۴)	" مسٹر پرویز صاحب	"	۵ر۰۰ "
(۳۵)	" لیفٹیننٹ کرنل ایس۔ ڈی طور صاحب۔	"	۱۰۰۰ر۰۰ "
(۳۶)	محترمہ بیگم میاں نصراللہ صاحب۔	کراچی	۱۰۰ر۰۰ "
(۳۷)	محترم طارق مصطفٰے صاحب	"	۱۰۰۰ر۰۰ "
(۳۸)	" خالد صاحب	ابوظہبی	۲۵ر۰۰ "
(۳۹)	" ماسٹر محمد ارشاد صاحب	گکھڑ گلی	۴ر۰۰ "
(۴۰)	" اختر عباس سعید صاحب۔	کوئٹہ	۱۰ر۰۰ "
(۴۱)	محترمہ مسز بلقیس اقبال صاحبہ	لاہور	۵۰ر۰۰ [illegible]
(۴۲)	محترم فصیح محمد صاحب۔	کراچی	۵ر۰۰ "
(۴۳)	" عبدالعزیز صاحب	"	۲۰ر۰۰ "
(۴۴)	" محمد اکرم صاحب	"	۱۰۰ر۰۰ "
(۴۵)	" عابد حسین قریشی صاحب	"	۱۰۰ر۰۰ "
(۴۶)	بزم طلوع اسلام۔	کراچی	۴۴ر۰۰ "

(۴۷) محترم داؤد حسن صاحب و دیگر احباب	کراچی	۲۰ر۰۰	روپے
(۴۸) محترمہ زبیدہ بیگم صاحبہ	"	۵ر۰۰	روپے
(۴۹) " فہمیدہ رشید صاحبہ	"	۱۰ر۰۰	روپے
(۵۰) " مسز رابعہ ڈار صاحبہ	لنڈن	۱۴۰ر۰۰	روپے
(۵۱) محترم رحمٰن صاحب خادم صاحب	بریڈفورڈ	۸۰ر۰۰	روپے
(۵۲) لنڈن کے ایک صاحب جو اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے۔		۱۰۰ر۰۰	روپے
(۵۳) محترم اللہ دتہ صاحب۔	بریڈفورڈ	۲۰ر۰۰	روپے
(۵۴) " محمد رشید صاحب	"	۲۱ر۰۰	روپے
(۵۵) " نور محمد بھٹی صاحب	"	۲۰ر۰۰	روپے
(۵۶) " کرامت حسین صاحب	"	۱۰۰ر۰۰	روپے
(۵۷) میسرز ایس۔ این احمد اینڈ کمپنی۔	شمالی آئرلینڈ	۵۶۰ر۳۱	روپے

(سیکرٹری) قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی (رجسٹرڈ)

پرویز صاحب کا درس قرآن کریم

لاہور میں — ہر اتوار کی صبح۔ بوقت ۸ بجے

بمقام ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

ملتان میں — بروز جمعہ۔ بعد از نماز مغرب۔

بمقام شاہ محمد اینڈ سنز۔ بیرون پاک گیٹ۔ ملتان شہر

لائلپور میں — بروز جمعہ۔ بوقت ساڑھے پانچ بجے شام۔

بمقام دفتر بزم طلوع اسلام۔ راجہ چوک ریل بازار۔ لائلپور۔

حقائق وعبر

۱۔ یہ ہوگا آپ کا اسلام

روزنامہ "مشرق" "اسلام پسند" گروہ کا ترجمان ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ یہ جماعتِ اسلامی کا نقیبِ خصوصی ہے۔ اس جہت سے اس میں اکثر اسلام سے متعلق مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس قسم کا اسلام اس کے صفحات میں پیش ہوتا ہے، جب کل کو (خدا نکردہ) پاکستان کا "وردبست" "اسلام پسند" گروہ کے ہاتھ میں آگیا تو وہی اسلام آپ کی مملکت کا مذہب قرار پائے گا۔ وہ اسلام کس قسم کا ہوگا" اس کی ایک جھلک اس مقالے سے آپ کے سامنے آسکے گی جو اس اخبار کی ۱۰ر جون ۷۰ء کی اشاعت میں "آفتابِ طریقت سیّد شمس تبریز سبزواری ملتانی" کے تذکرہ کے سلسلہ میں شائع ہوا ہے۔ اس کے دو ایک اقتباسات ملاحظہ فرمایئے۔

> ۴۵۵ھ میں آپ کے والد سیّد صلاح الدین محمد نور بخش نے جامِ شہادت نوش فرمایا۔ ان کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہوکر آپ بغداد پہنچے اور ایک سرائے میں اقامت فرمائی۔ یہاں کے علماء نے آپ پر بے دینی کا الزام لگایا اور شاہ احمد تکودار سے درخواست کی کہ انہیں شہر بدر کیا جائے۔ بادشاہ کو آپ سے بےحد عقیدت تھی۔ اس نے علماء سے کہا کہ یہ خدا رسیدہ بزرگ ہے، مجھے ڈر ہے کہ کہیں میرے بیٹے محمود پر کوئی آفت نہ آجائے۔ علماء نے جواب دیا کہ شہزادے کا بال تک بھی بیکا نہ ہوگا۔ اگر کچھ ہوا تو ہمارا ذمہ ہے۔ چنانچہ شاہ شمسؒ قاضی شرع کے حکم سے بغداد کو چھوڑ کر کاظمین تشریف لے گئے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ شہزادہ فوت ہوگیا۔ بادشاہ سخت پریشان ہوا اور علماء کو حکم دیا کہ فوراً فقیر سے معذرت طلب کرو تاکہ خداوندِ عالم میرے بچہ کو دوبارہ زندگی عطا فرمائے ورنہ میں تم سب کو قصاص میں قتل کردوں گا۔ چنانچہ علماء جمع ہوکر حضور کی خدمت میں پہنچے اور معذرت چاہی۔ بعد میں بہت منت سماجت کے آپ کو بغداد لے آئے۔ یہاں آپ نے دعا کی اور بچہ اللہ کے فضل سے کلمہ پڑھ کر اٹھ بیٹھا۔ اب علماء نے آپ پر تکفیر کا الزام لگا دیا اور کھال اترانے کے درپے ہوئے۔ آپ نے کملی اوڑھ کر کھال اتار دی۔ جو بعد میں سارے شہر میں نمائش کرکے پھرائی گئی۔ شام کو آپ نے واپس لے کر مثل لباس کے زیب تن کرلی۔

بغداد سے روانہ ہونے کے بعد کیا ہوا، اسے بھی ملاحظہ فرمائیے۔ تحریر ہے۔

پیر مرشد و مرید براستہ دیبل ۵۰۰ھ میں ملتان آپہنچے۔ ان دنوں یہاں شیخ الاسلام غوث بہاء الحق والدین قدس سرہٗ مسند ارشاد پر فائز تھے۔ جب آپ شہر میں داخل ہوئے تو آپ کے خلاف ایک کہرام برپا ہو گیا۔ آپ نہایت صبر و سکون سے لوگوں کے طنز آمیز جملے سنتے رہے اور روڑے کنکروں کی بارش میں سے گزرتے وہاں جا پہنچے جہاں آجکل ریلوے اسٹیشن ہے۔ اہل طریقت کے حلقوں میں آپ کے متعلق جو روایات مشہور ہیں ان کے مطابق احمد تکودار کا فرزند بھوک سے سخت نڈھال تھا۔ آپ نے اس مقام پر پہنچکر حضرت نے ایک نعرہ لگایا جس سے بیابان کی ایک ہرنی نمودار ہوئی۔ اس کے تھن دودھ سے لبریز تھے۔ آپ نے شہزادے کو پینے کا اشارہ کیا۔ پھر آپ نے تکبیر کہہ کر ہرنی کو ذبح کیا اور ضرورت کے مطابق اس کے پیٹ سے گوشت نکال کر باقی جسم کو سی دیا۔ ہرنی کو قم باذن اللہ کہہ کر کھڑا کیا اور وہ چوکڑیاں مارتی ہوئی چلی گئی۔

گوشت مل گیا تو سوال پیدا ہوا کہ اسے پکائیں کس طرح؟ سو اس مشکل کا حل یوں پیش کیا۔

آپ نے شہزادے کو حکم دیا کہ جاؤ شہر سے آگ لے آؤ تاکہ اس گوشت کو بھون کر کھائیں۔ شہزادہ سارے شہر میں آگ کی تلاش میں پھرا مگر کسی اہل دل کو رحم نہ آیا۔ بلکہ ایک ستم ظریف حلوائی نے تو اتنا ظلم کیا کہ جب یہ مسافر بچہ آگ لینے کے لئے اس کے ہاں پہنچا تو اس نے گرم تیل کا چمچہ اس کے گلاب جیسے چہرے پر دے مارا۔ نازنین شہزادہ شدت درد سے چلا اٹھا اور روتا ہوا مرشد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے اپنے عزیز ترین مرید اور روحانی فرزند کی یہ حالت دیکھی تو غصے سے کانپ اٹھے۔ بدن کے عضو عضو میں قہر و غضب کی لہر دوڑ گئی۔ جلال کی حالت میں آسمان کی جانب نگاہ کی۔ سورج کو دیکھا اور فرمایا۔ او شمس! دیکھ میں بھی تیرا ہم نام ہوں اور ملتان کے لوگ مجھے گوشت بھوننے کے لئے آگ نہیں دیتے۔ ذرا نیچے آ تاکہ میں تیری حرارت سے اس معصوم بچے کے لئے گوشت بھون سکوں۔ روایات میں کہ اسی وقت بلا کی گرمی پڑی جسے لوگ آفتاب سوا نیزے پر آنے سے تشبیہ دیتے ہیں۔ لوگ گرمی سے تڑپنے لگے۔ شہر کے علماء، صلحا اور زہاد آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور معذرت طلب کی اور ملتان میں رہائش کے لئے اپنے مکانات پیش کئے۔ اس پر آپ کا غصہ فرو ہوا، اور آفتاب سے کہا۔ باز برو۔ تب کہیں جا کر ملتان کی سرزمین ٹھنڈی ہوئی اور خلق خدا کے تن بدن میں سکون آیا۔ کہتے ہیں اس دن سے ملتان کی گرمی مشہور عالم چلی آتی ہے۔ اگرچہ اب یہ کیفیت نہیں رہی۔

ساتھ آٹھ سو سال کے بعد جا کر کہیں اہل ملتان کی تقصیر معاف ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ورود ملتان سے پہلے حضرت صاحب

افریقہ کے صحراؤں میں بھی اسی طرح گوشت بھونتے چلے آتے ہونگے۔ کیونکہ وہاں کا درجۂ حرارت تو ملتان سے بھی دس بیس ڈگریاں زیادہ ہوتا ہے۔

(۰)

۲۰ کی مِرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ!

تقسیم ہند کے زمانہ سے لیکر آج تک مسلمانانِ کشمیر جن قیامت خیز تباہیوں اور بربادیوں کی آماجگاہ بنے چلے آرہے ہیں، پاکستان ’مسئلہ کشمیر‘ کے سلسلہ میں جس طرح مسلسل وقفِ اضطراب ہے اور گرداب میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح ’ایک ہی نقطہ کے گرد، محوِ گردش ہے، ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کی کشیدگی میں جس سوال کو مرکزی حیثیت حاصل ہے‘ ان سب کی ذمہ دار ایک اور صرف ایک شخصیت ہے اور وہ ہیں شیرِ کشمیر شیخ محمد عبداللہ صاحب جو کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے موجب بنے۔ ہم نے جب ان کی اس انسانیت سوز حرکت اور ایمان فروش سازش پر انہیں غدارِ ملت کہا اور عبد الطاغوت قرار دیا‘ تو خود پاکستان کے بعض حضرات‘ کہ گوسالۂ قومیت پرستی کی محبت جن کے دل کی گہرائیوں تک میں اتر چکی تھی، اس پر چیں بجبیں ہوئے۔ لیکن ہم نے نہ اُس وقت اپنی اس رائے کی تبدیلی کے لئے کوئی اطمینان بخش وجہ پائی اور نہ ہی اس تیئیس سال کے عرصہ میں‘ اس بارے میں ہمیں کوئی شک و شبہ لاحق ہوا۔ حتیٰ کہ جب ’چند سال ادھر شیخ صاحب‘ بھارت کے پیامبرِ مصالحت بن کر پاکستان آئے تو ہم نے اپنے عزیزانِ وطن کو کھلے الفاظ میں متنبہ کیا کہ وہ اس شخص کے جھانسے میں نہ آجائیں۔ بارے الحمد کہ اب شیخ صاحب نے خود ہی اپنے اس جرمِ عظیم کا اعتراف کر کے‘ ہماری رائے کی تصدیق کر دی ہے۔ چنانچہ ۲۷ رجون کے پاکستان ٹائمز میں حسبِ ذیل خبر شائع ہوئی ہے۔

(لندن - ۲۶ رجون) کشمیری لیڈر شیخ محمد عبداللہ نے‘ اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ اس لئے کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق پر رضامندی سے ایک بہت بڑی حماقت کا ارتکاب کیا تھا (انہوں نے کہا) کہ یہ حماقت اتنا بڑا جرم ہے جس کی پاداش میں وہ ہر قسم کی سزا کے مستحق ہیں۔

اس امر کا اعتراف انہوں نے کشمیر کنونشن میں کیا جو حال ہی میں سرینگر میں منعقد ہوئی ہے اور جس کی کارروائی لندن کے ہفتہ وار اخبار مشرق میں شائع ہوئی ہے۔

شیخ صاحب نے کہا کہ ان سے یہ حماقت اس لئے سرزد ہوئی کہ انہوں نے پنڈت نہرو پر اعتماد کر لیا تھا۔ انہوں نے پنڈت نہرو کو اس درجہ قابلِ اعتماد سمجھ لیا تھا کہ انہیں اس کا تصور تک نہیں آ سکتا تھا کہ پنڈت جی اپنے مقدس وعدوں اور محکم قول و قرار سے یوں پھر جائیں گے۔ پنڈت نہرو کشمیر

کو اہل ہند کی کالونی بنانا چاہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے ان تمام وعدوں سے پھر گئے جو انہوں نے اقوامِ متحدہ کی حفاظتی کونسل سے کئے تھے۔ اس مقام پر شیخ عبداللہ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور انہوں نے کہا کہ میری یہ حماقت ایسا سنگین جرم ہے کہ قوم کو حق پہنچتا ہے کہ اس کی سزا کے طور پر وہ مجھے ٹھکرا دے۔ میں انتہائی تأسف سے اس کا اعتراف کرتا ہوں۔

شیخ صاحب کا یہ اعتراف ان کے ضمیر کی آواز سہی لیکن اس سے اب فائدہ؟ کسی کی آنکھ میں چاقو مار کر اسے اندھا کر دینے کے بعد آنسو بہانے سے حاصل کیا ہو سکتا ہے۔ بعض جرم ہوتے ہی ایسے ہیں جن کا نقصان ناقابلِ تلافی ہوتا ہے۔

اور یہ جرم بھی ایسا جس سے کسی ایک فرد کا نقصان نہیں ہوا جس نے پوری کی پوری قوم کو تباہ کر دیا اور پاکستان کی مملکت کو ہر قسم کے خدشات و خطرات کے گرداب میں پھنسا دیا۔ اقبال نے جب انتہائی کربِ الم سے چیخ کر کہا تھا کہ

ای جہاں بے ابتدا بے انتہاست
بندۂ غدار را مولا کجاست

تو وہ اسی جگر پاش احساس کی صدائے بازگشت تھی۔

(ثبت)

بقیہ "باب المراسلات" صفحہ ۴۷ سے مسلسل

اتنی سیاست سے ابھری اور اسے لاکھوں روپے کے خرچ سے کامیاب بنایا گیا۔ اس کے بعد آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہندوستانی مسلمانوں کے خلاف وہاں کے ہندو جو تباہیاں مچا رہے ہیں ان کا یہاں کوئی چرچا نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ ان کی یاد تک بھی ذہنوں میں باقی نہیں رہی۔ فرمائیے "شوکتِ اسلام ڈے" اپنے مقصد میں کامیاب رہا ہے یا نہیں؟ شیخ صاحب محترم کا دل تو خدا کے حضور جواب دہی سے لرز رہا ہے لیکن جن بارگاہوں میں مودودی صاحب نے جواب دینا ہے وہاں سے وہ نہایت سرخرو اور شادکام لوٹے ہونگے۔ اپنا اپنا یوم الحساب اور اپنا اپنا حسیب ہے۔

تو و طوبیٰ و ما و قامتِ دوست
فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

(ثبت)

بابُ المراسلات

گوسالہ "شوکتِ اسلام ڈے"

محترم شیخ عبدالحق صاحب (ایڈووکیٹ سپریم کورٹ لاہور) ایک مرنجاں مرنج، انسان دوست سادہ دل مسلمان ہیں۔ فرقہ وارانہ افتراق سے بلند اور گروہ بندانہ اختلافات سے مبرّیٰ۔ دل دردِ ملّت سے لبریز، اور دماغ مصالحِ امّت سے سرشار۔ ۳۱ مئی کو ملک میں "شوکتِ اسلام ڈے" کے نام سے جو ڈھونگ رچایا گیا، اس سے ان کے قلبِ حسّاس نے جو تأثر لیا، اس کا اظہار انہوں نے امیر جماعتِ اسلامی کے نام ایک خط میں فرمایا اور خط کی نقل ہمیں بھیجدی جسے شیخ صاحب کے شکریہ کے ساتھ درج ذیل کیا جاتا ہے۔ ہم نے شیخ صاحب کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ اگر انہیں مودودی صاحب کیطرف سے کوئی جواب موصول ہو تو اس کی ایک نقل بھی ہمیں مرحمت فرمائیں۔ تا دمِ تحریر ان کی طرف سے ہمیں کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی جس سے مترشح ہوتا ہے کہ انہیں مودودی صاحب کیطرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔ محترم شیخ صاحب کا مکتوب ملاحظہ فرمایئے۔

لاہور۔ ۲۵ جون ۱۹۷۰ء

جناب مولانا صاحب! السلام علیکم۔ شوکتِ اسلام جلوس جسکی قیادت آپنے کی تھی میری ناقص رائے میں صرف بے محل اور بے موقع ہی نہیں تھی۔ بلکہ اس کج رو کارواں کے دل سے احساسِ زیاں تک مٹ جانے کا بیّن ثبوت تھا۔ ملک کے اندر اور ملک سے باہر جن حالات سے مسلمان دوچار ہیں ان سے ہم کو ندامت آنی چاہیئے نہ کہ اُسے ملی شوکت کا راگ الاپ کر خوشی و مسرت کے شادیانے بجانے کا موقع بنانا چاہیئے۔ کسی سے یہ بات مخفی نہیں کہ ملک کے اندر کسی کی جان، مال و آبرو محفوظ نہیں ہے۔ بیچاری معصوم بچیوں اور عورتوں کا صرف تنہا گھر سے باہر جانا ہی خطرے سے خالی نہیں، گھروں کی چار دیواری کے اندر بھی وہ محفوظ نہیں ہیں۔ آئے دن واقعات دیکھنے اور سننے میں آتے ہیں کہ کسی لڑکی کو جبراً اٹھا لیا گیا اور اس پر وہ تہذیب سوز مظالم ڈھائے گئے کہ خدا کی پناہ۔ طرّہ یہ کہ ایسے قبیح افعال کے ارتکاب سے وہ لوگ بھی مبرّا نہیں جن پر نظم و نسق کے قیام اور اس کے مضبوط کرنے اور رعایا کی جان و مال و آبرو کی حفاظت کی ذمہ داری ہے۔ ملک سے باہر جو ہو رہا ہے وہ ایک الگ جانکاہ داستان ہے۔ ہندوستان میں مساجد کی بے حرمتی تو الگ رہی، معصوم بچے اپنی بدنصیب

ماؤں کی آنکھوں کے سامنے ذبح کئے جاتے ہیں اور زندہ جلائے جاتے ہیں۔ اور مستورات کی آبرو ریزی تو وہاں کا معمول ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۵۰ ہزار نوجوان مسلمان لڑکیاں جنہیں تقسیم ملک کے وقت "شوکتِ اسلام کے پرستاران" اپنی بے غیرتی کا احساس نہ کرتے ہوئے وحشی درندوں کے رحم و کرم پر چھوڑ آئے تھے، ان وحشیوں کی ہوس کا شکار ہو کر دم توڑ چکی ہیں اور بعض ممکن ہے ابھی تک اس زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہوں۔ اسرائیلی شیطان ہمارے مقاماتِ مقدسہ پر قابض ہے اور عالم بد ہیں حضور سرور کائنات کے روضۂ مبارک پر قبضہ کر کے اس کی بے حرمتی کے خواب دیکھ رہا ہے۔ لاکھوں عرب مسلمان موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے ہیں اور لاکھوں بے خانماں ہو چکے ہیں اور یہ سلسلہ روز بروز بڑھ رہا ہے مگر آپ کو عالمِ دین ہونے کے باوجود ان حالات میں شوکتِ اسلام کی جھلک نظر آتی ہے۔

ایں چہ بوالعجبی است؟

اُس ماں سے پوچھئے جس کا بچہ اُس کی آنکھوں کے سامنے ذبح کیا گیا ہے یا جس کی جواں عمر دوشیزہ دختر کی آبرو ریزی کی گئی ہے اور پھر سوچئے کہ آپ کے اس جلوس کی کیا حیثیت اور اسکے کیا معنی ہیں۔ ہم لوگ قیامت کے روز حضور کو کیا منہ دکھائینگے اور خدائے قدوس کو کیا جواب دینگے۔ آپ تو اپنی ذہانت کی بنا پر اپنے لئے کوئی حجت شاید نکال لیں، دوسروں کے لئے تو ندامت کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا۔ خدارا دوسروں کو اس ندامت سے بچائیے۔

راقم - عبدالحق ایڈووکیٹ - لاہور

مکرر۔ "شوکتِ اسلام جلوس کے بعد فوراً ہی یہ خط لکھنا چاہتا تھا مگر صحت کی خرابی کی وجہ سے تاخیر ہوتی گئی۔"

(عبدالحق)

طلوعِ اسلام

جن جگر پاش تاثرات کا اظہار محترم شیخ صاحب نے اپنے مکتوب گرامی میں فرمایا ان میں ملت کا ہر دلِ درد آگیں برابر کا شریک ہے۔ لیکن جس مقصد کے لئے یہ ڈھونگ رچایا گیا تھا، اس میں مودودی صاحب کو یقیناً کامیابی ہوئی ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف فسادات کا سلسلہ یوں تو شروع سے جاری ہے لیکن گزشتہ اپریل۔ مئی میں ان کی تباہ کاریاں اور خونریزیاں انتہائی شدت اختیار کر گئی تھیں جن کی وجہ سے مسلمانانِ پاکستان کے دل میں، ہندوستان کے خلاف، نفرت و عداوت کے جذبات بڑی تیزی سے بھڑک اٹھے تھے۔ یہ چیز ان عناصر کے مشئوم عزائم کے خلاف جاتی تھی جو بھارت و پاکستان کو پھر سے "ایک کرنے" کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں۔ ان کی مصلحت کوشیوں کا تقاضا تھا کہ پاکستانی مسلمانوں کے جذبات کا رُخ کسی اور طرف موڑ دیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے "شوکتِ اسلام ڈے" کی اسکیم

رفیع اللہ

علمائے کرام ——— امام غزالیؒ کی نگاہ میں

(قسط سوم)

قسط دوم طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۷۰ء میں شائع ہو چکی ہے!

علمائے حق کے پانچ اخلاق

اور بعض نے کہا ہے کہ علمائے حق کی علامات پانچ اخلاق ہیں جو قرآن مجید کی پانچ آیات سے سمجھے جاتے ہیں۔ اول خشیتِ الٰہی۔ دوم خشوع۔ سوم تواضع چہارم حسن خلق۔ پنجم آخرت کو دنیا پر ترجیح دینا۔ اور یہ زہد ہے۔ (۱) خشیت اس آیت سے ثابت ہوتی ہے۔ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمَآءُ۔ (اللہ کے بندوں سے اس سے ڈرنے والے علماء ہیں)۔ (۲) خشوع اس آیت سے۔ خَاشِعِیْنَ لِلّٰہِ لَا یَشْتَرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ ثَمَنًا قَلِیْلًا۔ (ڈرتے ہیں اللہ تعالےٰ سے اور اس کی آیتوں کے بدلے تھوڑی قیمت نہیں لیتے۔ (۳) تواضع کا ذکر اس آیت شریف میں ہے۔ وَاخْفِضْ جَنَاحَکَ لِلْمُؤْمِنِیْنَ۔ (۴) اور اس آیت شریف میں حسن خلق کی طرف اشارہ ہے۔ فَبِمَا رَحْمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ لِنْتَ لَھُمْ۔ (تو اللہ کی رحمت سے ان کے لئے نرم دل بنا)۔ (۵) اور زہد[1] اس آیت سے۔ وَقَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَیْلَکُمْ ثَوَابُ اللّٰہِ خَیْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا۔ (اور اہلِ علم نے کہا، تمہارے لئے ہلاکت ہے اللہ کا ثواب ایمان لانے اور نیک کام کرنے والوں کے لئے بہتر ہے)

جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی۔ فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ اَنْ یَّھْدِیَہٗ یَشْرَحْ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ۔ (جسے اللہ تعالےٰ ہدایت دینا چاہتے ہیں اس کا سینہ اسلام کے لئے کھول دیتے ہیں) تو کسی نے عرض کیا کہ اس شرح

---

[1] زہد کا لفظ سارے قرآن میں صرف ایک مقام پر آیا ہے جہاں کہا ہے کہ اہلِ قافلہ چونکہ حضرت یوسف سے کوئی رغبت نہیں رکھتے تھے اس لئے انہوں نے اسے چند سکوں کے عوض بیچ دیا۔ (پ ۱۲)؟ (طلوعِ اسلام)

سے کیا مراد ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ جس وقت نور کسی دل میں ڈالا جاتا ہے تو سینہ اس کے لئے کھل جاتا ہے۔ عرض کیا گیا کہ اس کی کیا پہچان ہے؟ آپ نے فرمایا کہ دارالغرور یعنی دنیا سے علیحدہ رہنا اور دارالخلود یعنی آخرت کیطرف رجوع کرنا۔ اور موت کے وقت سے پہلے اس کے لئے تیاری کرنا۔

اور علمائے حق کی ایک پہچان یہ ہے کہ ان کی زیادہ بحث علم اعمال کے متعلق ہو اور جو چیزیں عمل کو فاسد، دلوں کو پریشان، وسواس پیدا کرتی اور شر کو ابھارتی ہیں ان کی حقیقت سے واقف ہو۔ کیونکہ دین کی اصل شر سے بچنا ہے۔

اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اعمال فعلی ہوتے ہیں اسلئے آسان ہوتے ہیں۔ اور ان میں سب سے اعلیٰ عمل دل و زبان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مداومت اختیار کرنا ہے اور اس کی خوبی جب ہے کہ جو چیز اعمال کی مفسد اور دل کو پریشان کرنے والی ہو اسے پہچانے، کیونکہ اس کی بہت سی شاخیں اور ٹہنیاں ہیں اور آخرت کے راستے پر چلنے کے لئے ان کی ضرورت ہوتی ہے۔ باقی رہے علمائے دنیا تو وہ مقدمات اور ان کے فیصلوں کے بارے باریکیوں کے پیچھے لگے رہتے ہیں اور ان کی ایسی ایسی صورتیں فرض کرتے رہتے ہیں جن کے واقع ہونے کا صدیوں تک امکان نہ ہو۔ اور اگر واقع بھی ہوں تو ان کے بتانے والے اور بہت ہیں۔ لیکن جو چیزیں ان کے ساتھ لازم ملزوم ہیں اور رات دن ان کے دلوں، وسوسوں اور اعمال میں پیش آتی رہتی ہیں انہیں چھوڑ چکے ہیں اور جس نے اللہ تعالیٰ کی قربت حاصل کرنے کی بجائے لوگوں میں مقبول ہونے کے لئے اپنے اہم کام کو چھوڑ کر دوسرے کے کام کیطرف توجہ کی تو اس سے زیادہ نیک بخت سے کوئی دور نہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا بدلہ یوں ملیگا کہ نہ تو وہ مخلوق کے نزدیک مقبول ہو کر کوئی دنیاوی نفع حاصل کر سکیگا۔ بلکہ الٹا دنیاوی مصائب کی وجہ سے اس کی زندگی اس پر تنگ ہو جائے گی۔ اور پھر قیامت میں بھی وہ حرماں نصیب ہوگا۔ اور اللہ کے مقرب بندوں اور باعمل لوگوں کی کامیابی کو حسرت بھری نظروں سے دیکھے گا۔ اور یہ اس کے لئے بڑا خسارے کا سودا ہے۔

بدی سے بچنے کے لئے اسکی پہچان ضروری ہے

حضرت حسن بصریؒ کا طرز گفتگو انبیاء علیہم السلام کے طرز گفتار کے مشابہ تھا اور ہدایت میں صحابہ کرامؓ کے زیادہ قریب۔ ان باتوں پر سارے اکابر کا اتفاق ہے۔ آپ کی وعظ و نصیحت میں زیادہ تر دلوں کے خطروں اعمال کی خرابیوں، نفس کے وسوسوں اور شہوات نفسانی کے باریک اور خفیہ اوصاف کے بارے میں ہوا کرتا تھا کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ آپ ایسی گفتگو فرماتے ہیں جو ہم اوروں سے نہیں سنتے۔ آپ نے یہ طرز تکلم کس سے سیکھا ہے۔ آپ نے فرمایا حذیفہؓ بن یمان سے۔ اور حضرت حذیفہؓ سے کہا گیا تھا کہ آپ ایسی گفتگو کرتے ہیں کہ ہم صحابہ کرام میں دوسروں سے نہیں سنتے۔ آپ نے فرمایا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس تقریر سے مخصوص

فرمایا تھا۔ لوگ آپ سے خیر کا حال پوچھتے تھے اور میں آپ سے بدی کا حال دریافت کیا کرتا تھا اس ڈر سے کہ کہیں اس میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔ اور میں نے یہ جان لیا تھا کہ مجھے خیر کا بھی علم ہو جائے گا۔ ایک دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا کہ میں نے یہ جان لیا کہ جو شخص برائی کو نہیں پہچانتا وہ بھلائی کو بھی نہیں پہچان سکتا۔ ایک دوسری روایت میں آپ نے فرمایا کہ لوگ حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کرتے تھے کہ جو شخص نیک کام کرے اس کو کیا ثواب ملے گا یعنی اعمال اور فضائل کا حال دریافت کیا کرتے تھے لیکن میں یہ سوال کرتا کہ فلاں فلاں عمل کو کون سی چیز فاسد کر دے گی۔ جب آپ نے دیکھا کہ میں اعمال کی آفتوں ہی کے بارے سوال کرتا ہوں تو آپ نے مجھے اس علم سے مخصوص فرما دیا۔ اور حضرت حذیفہ رضہ منافقوں کو پہچاننے کا بھی خصوصی علم رکھتے تھے اور وہ نفاق اس کے اسباب اور فتنہ کی باریکیوں کے جاننے میں ماہر تھے۔ حضرت عمرؓ، حضرت عثمان رضہ اور اکابر صحابہ آپ سے عام و خاص فتنوں کے بارے دریافت کیا کرتے تھے۔ منافقین کے بارے جب ان سے پوچھا جاتا تو ان کا نام لینے کی بجائے ان کی باقی تعداد بتا دیا کرتے تھے۔ اور حضرت عمرؓ ان سے پوچھا کرتے کہ مجھ میں کوئی نفاق کی بو تو نہیں تو آپ نے ان کو منافقت سے بری قرار دیا۔ اور جب حضرت عمرؓ کو کسی کی نماز جنازہ کے لئے بلایا جاتا تو آپ اگر حذیفہ رضہ کو جنازے کے ساتھ شریک و موجود پاتے تو نماز جنازہ پڑھا دیتے ورنہ ترک کر دیتے تھے۔ اسی وجہ سے حضرت حذیفہ رضہ "صاحب السر" مشہور تھے۔[۱]

مختصر یہ کہ دل کے احوال و مقامات پر نظر رکھنی علمائے حق کا قاعدہ ہے۔ کیونکہ دل ہی تو قرب الٰہی کے لئے کوشش کرنے والا ہے۔ اب یہ فن اجنبی اور پرانا ہو گیا ہے اور اگر کوئی اہل علم اس فن میں سے کوئی چیز حاصل کرنا چاہتا ہے تو لوگوں کو عجیب و غریب معلوم ہوتا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ واعظوں کا دھوکا ہے۔ تحقیق سے اس فن کو دور کا بھی تعلق نہیں۔ اصل میں وہ تحقیق صرف مناظرانہ باتوں ہی کو سمجھتے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ لوگ عام طور پر اس چیز کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو آسان اور ان کی طبیعتوں کے موافق ہو۔ کیونکہ حق تلخ ہے اور اس پر قائم ہونا بڑا مشکل کام ہے۔ ساتھ ہی اس کا ادراک بھی سخت ہے اور راستہ باریک ہے۔ خاص طور پر دل کی صفات معلوم کرنا اور اسے اخلاق ذمیمہ سے پاک کرنا تو ہمیشہ جان جوکھوں کا کام رہا ہے۔ اس لئے حق کی طرف متوجہ ہونے والے کی مثال اس دوائی پینے والے مریض سے دی جاتی ہے جو شفا کی امید میں کڑوی دوائی پی جاتا ہے۔ یا حق پرست کی مثال اس شخص جیسی ہے جو ساری عمر روزے رکھ کر ایسی سختیاں برداشت کرتا ہے کہ موت کے وقت اس کی عید ہو۔ پس حق کے اس مشکل راستے کی طرف کس طرح

---

[۱] آپ نے دیکھا کہ احیاء العلوم میں کس کس قسم کی روایات ہیں!　　(طلوعِ اسلام)

زیادہ رغبت ہو سکتی ہے۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ بصرے شہر میں ایک سو بیس واعظ تھے مگر علم یقین، دلوں کے حالات اور باطن کی صفات پر تین واعظوں کے سوا کوئی گفتگو نہ کرتا تھا۔ وہ حضرات سہل تستری رح، الصبیحی رح، اور عبدالرحیم رح تھے۔ جہاں ان عام واعظین کی مجلس میں حاضرین کی تعداد بے شمار ہوتی تھی وہاں ان تین حضرات کی مجلس میں بہت کم لوگ ہوا کرتے تھے۔ بلکہ شاذو نادر ہی ان کی گنتی دس سے زیادہ ہوتی تھی۔ اس لئے کہ نفیس اور عمدہ چیز کے اہل خاص خاص لوگ ہی ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جو چیز عامۃ الناس کے لئے ہوتی ہے، وہ آسان ہوتی ہے اس لئے اس کے چاہنے والے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔

علمی اعتماد

علمائے حق کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ اپنے علوم پر اعتماد اپنی بصیرت اور دل کی صفائی کے ادراک کے ذریعے کرے نہ کہ صحیفوں اور کتابوں کے ذریعے۔ اور یہ اعتماد اس تقلید کے ذریعے بھی نہ ہو جو وہ دوسروں سے سنے کیونکہ تقلید کے حقدار تو صرف حضور صلے اللہ علیہ وسلم ہیں کہ جو کچھ آپ نے حکم دیا ہو یا فرمایا ہو۔ اور صحابہ کرام رضہ کی تقلید بھی صرف اس وجہ سے کی جائے گی کہ آپ نے وہ عمل حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے سنا ہوگا۔ اور پھر جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کی پیروی کرے تو چاہیے کہ ان کے اسرار کو بھی سمجھے۔ اس لئے کہ وہ ان افعال کی پیروی اس لئے کر رہا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے انہیں سرانجام دیا ہے اور ضروری ہے کہ ان اعمال کے ضرور کوئی اسرار ہونگے جن کی وجہ سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ان پر عمل فرمایا تھا۔ اس لئے وہ اعمال اور اقوال کے اسرار کی بابت خوب تحقیق کرے۔ کیونکہ اگر وہ ان کے اسرار معلوم کئے بغیر یاد کرے گا تو وہ ان کا عالم تصور نہ ہوگا بلکہ یوں سمجھے کہ اس کا علم ایسا ہوگا جیسا کہ کچھ چیزیں کسی برتن میں جمع کر دی گئی ہیں۔ جس کے دل سے پردہ اٹھ گیا اور وہ نور ہدایت سے منور ہو گیا تو وہ بذات خود امام اور پیشوا بن جاتا ہے۔ اس لئے اسے کسی دوسرے کی تقلید نہیں کرنی چاہیے۔ اس لئے حضرت ابن عباس رض نے فرمایا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی ایسی شخصیت نہیں جس کی ہر بات تسلیم کی جائے۔ حضرت ابن عباس رض نے فقہ حضرت زید بن ثابت سے سیکھی تھی اور قرأت حضرت ابی بن کعب کو سنائی تھی اور پھر ان دونوں علوم میں اپنے ان دونوں اساتذہ سے اختلاف کیا۔

دینی کتابیں سن ہجری کے ایک سو بیس برس بعد تالیف ہونی شروع ہوئیں

بعض سلف صالحین نے فرمایا کہ جو کچھ ہمیں حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے پہنچا ہے اسے تو ہم بسر و چشم مانتے ہیں اور جو صحابہ کرام رض سے پہنچا ہے اس میں سے بعض کو اختیار کرتے ہیں اور بعض پر عمل نہیں کرتے اور تابعین کے اقوال کا معاملہ یہ ہے کہ وہ بھی آدمی تھے اور ہم بھی آدمی ہیں اور اس بارے میں صحابہ کرام رض کو فضیلت اس لئے ہے کہ انہوں نے حضور

صلے اللہ علیہ وسلم کے حالات کے قرآن کو دیکھا اور اس طرح جو باتیں معلوم ہوتیں انہیں دلی اطمینان حاصل ہوا۔ اور ان پر نورِ نبوت کا فیضان اتنا تھا جس نے انہیں خطا سے محفوظ رکھا اور جب غیر سے سنی ہوئی بات پر اعتماد کرنا ناپسندیدہ تقلید ہے تو کتابوں اور تصانیف پر اعتماد کرنا اس سے بھی زیادہ ناپسندیدہ ہے کیونکہ یہ تو نئی چیزیں ہیں جو صحابہؓ اور تابعین رح کے ابتدائی زمانے میں ناپید تھیں۔ یہ تو ہجرت کے ایک سو بیس برس بعد تالیف ہونی شروع ہوئیں جبکہ تمام صحابہ کرامؓ، تابعین رح اور حضرت سعید بن مسیبؓ اور حسن بصریؒ جیسے بزرگ وفات پا چکے تھے۔

صدرِ اوّل میں حدیث کی کتابوں کی تالیف ناپسندیدہ تھی

صدرِ اول کے لوگ حدیث کی کتابوں کا مدون کرنا یا کسی اور کتاب کو تصنیف کرنا سخت ناپسند کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کتابوں کی وجہ سے لوگ قرآن مجید کو پڑھنے اور اس پر غور و فکر سے غافل ہو جائیں گے۔ اس لئے وہ کہا کرتے تھے کہ قرآن مجید کو اس طرح یاد کرو جس طرح ہم یاد کیا کرتے تھے۔ شاید اسی لئے حضرت ابوبکر صدیق رض اور کچھ دوسرے صحابہؓ نے قرآن مجید کو ایک مصحف کی صورت میں جمع کرنا مناسب نہ سمجھا اور فرمایا کہ ہم کس طرح ایسی بات کریں جسے حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا[1]۔ اور انہیں یہ خدشہ بھی تھا کہ لوگ کہیں قرآن مجید کو لکھا ہوا دیکھ کر کافی سمجھیں اور تلاوت چھوڑ دیں۔ چنانچہ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ قرآن مجید کو ایسا ہی رہنے دو تاکہ لوگ ایک دوسرے سے سیکھ کر پڑھا کریں اور یہ ان کا شغل و مقصود بنا رہے۔ لیکن حضرت عمر رض اور چند دوسرے صحابہؓ نے اسے کتابی صورت دینے پر اصرار کیا اور دلیل دی کہ اگر لوگوں پر سستی چھا گئی یا کسی لفظ کی قرآنت کے بارے میں کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو اس اختلاف کو دور کرنے کے لئے کوئی مستند اصل موجود نہ ہوگی تو کیا کیا جائے گا۔ بس حضرت ابوبکرؓ کا دل بھی اس معاملے میں کھل گیا اور قرآن مجید کو ایک مصحف میں جمع کرنے کا پاک فریضہ سرانجام دیا۔ امام احمد بن حنبلؒ، امام مالکؒ کے موطا تصنیف کرنے کو ناپسندیدگی سے دیکھتے تھے اور فرماتے تھے کہ جب تک صحابہؓ سے کوئی تصنیف ثابت نہ ہو بدعت ہے۔

اسلام میں سب سے پہلی تصنیف

اور کہا گیا ہے کہ اسلام میں سب سے پہلی کتاب جو تصنیف ہوئی وہ ابن جریج کی کتاب ہے جو آثار اور حضرت ابن عباسؓ کے دو شاگردوں مجاہدؒ اور عطارح کے تفسیری اقوال پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب مکہ شریف میں تصنیف ہوئی پھر

---

[1] یہ صحیح نہیں۔ قرآن مجید خود رسول اللہ کے زمانہ میں مدون شکل میں موجود تھا۔ (طلوعِ اسلام)

یمن میں معمر بن راشد الصنعانی نے ایک کتاب میں سنن ماثورہ جمع کیں۔ تیسرے نمبر پر مدینہ شریف میں موطا امام مالکؒ ہے اور پھر امام سفیان ثوریؒ نے اپنی الجامع تصنیف فرمائی۔ پھر چوتھی صدی میں فلسفیانہ کتابیں وجود میں آئیں اور لوگ مناظروں اور جھوٹے علوم میں منہمک ہو گئے۔ پھر عامۃ الناس میں قصہ گوئی اور وعظ گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ تو اس وقت سے علم یقین کم ہونے لگا۔ اور پھر اس کے بعد تو معاملہ اس حد تک جا پہنچا کہ علم قلبی، یا نفس کی صفات معلوم کرنا اور شیطان کی مکاریوں پر آگاہی حاصل کرنا ایک عجیب بات ہو گئی۔ اور سوائے معدودے چند افراد کے سب لوگوں نے ان علوم سے منہ پھیر لیا۔ اور اب صرف اسی شخص کو عالم دین کہا جاتا ہے جو خوب مناظرے کرے اور چکنے چپڑے الفاظ اور مقفّٰی عبارتوں میں قصے بیان کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان وعظوں کے سننے والے عامۃ الناس ہوتے ہیں جنہیں علم حقیقی کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ اور نہ ہی ان کے سامنے صحابہؓ کی سیرت یا علوم ہوتے ہیں جن سے وہ یہ اندازہ کر سکیں کہ موجودہ عالم دین کس طرح ان کے بالکل الٹ واقع ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس بے خبری کی وجہ سے ان کے لئے "عالم دین" کا لفظ مستقل ہو گیا۔ اور پھر یہ نام نسلاً بعد نسلاً چلتا رہا۔ اور اس صورت حالات کا نتیجہ یہ نکلا کہ علم آخرت لپیٹ لیا گیا یہاں تک کہ عامۃ الناس کو تو علم اور کلام و فلسفہ کے فرق کا بھی امتیاز نہ رہا۔ صرف چند ہی لوگ رہ گئے تھے جو اس فرق کو محسوس کرتے تھے۔ جب اس زمانے میں دین میں یہ کمزوری آ گئی تھی تو اس زمانے کا کیا پوچھتے ہو اب اگر کوئی علم کلام وغیرہ کا انکار کرے تو دیوانہ کہلاتا ہے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کی فکر میں لگا رہے اور خاموش رہے۔

بدعتوں سے اجتناب

اور علمائے حق کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ بدعات سے سخت اجتناب کرے چاہے اس پر جمہور نے اتفاق ہی کیوں نہ کر لیا ہو اور جو بدعت صحابہؓ کے بعد وجود میں آئی، اس پر جمہور کا اتفاق اسے دھوکے میں نہ ڈالے۔ بلکہ اسے چاہیئے کہ وہ صحابہؓ کی سیرت، حالات و اعمال کی تحقیق و جستجو کرے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ آیا وہ لوگ درس دینے، کتابیں لکھنے، مناظرہ کرنے، قاضی اور حاکم بننے، اوقاف کے متولی، یتیموں اور وصیت کے مال کے امین ہونے اور سلاطین سے میل جول بڑھانے میں مشغول رہا کرتے تھے یا وہ خوف و حزن، فکر و مجاہدہ اور ظاہر باطن کی دیکھ بھال، چھوٹے بڑے گناہوں سے بچنے، نفس کی خفیہ خواہشات اور شیطان کی مکاریوں کو معلوم کرنے میں مشغول ہوتے تھے۔

یہ ایک قطعی حقیقت ہے کہ ہر زمانے کے لوگوں میں سے سب سے زیادہ عالم دین اور حق کے قریب وہ شخص ہے جو صحابہ کرامؓ کے مشابہ ہو اور سلف صالحین کے طریقوں سے اچھی طرح واقف ہو۔ اس لئے کہ دین انہی ہستیوں سے لیا گیا ہے۔ اور اسی لئے حضرت علیؓ نے فرمایا کہ تم میں سے بہتر وہ شخص ہے جو دین اسلام کا

مفہوم القرآن

میں نے احباب سے مشورہ طلب کیا تھا کہ مفہوم القرآن کا جدید ایڈیشن طبع کیا جائے تو وہ اس میں کس قسم کی تبدیلیاں ضروری سمجھتے ہیں۔ میری اس درخواست کے جواب میں قارئین کے وسیع حلقہ کیطرف سے جس قدر خطوط موصول ہوتے ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ احباب کو اس میں کس قدر دلچسپی ہے۔ فالحمدللہ علیٰ ذالک!

(۲) احباب کی طرف سے جو تجاویز موصول ہوئی ہیں ان میں اکثریت کا مشورہ یہ ہے کہ مفہوم القرآن کو ایک ایسی جامع کتاب بنایا جائے جس میں لغات بھی ہوں، ترجمہ بھی، مفہوم بھی ہو اور تفسیر بھی اور آخر میں ایک ایسا انڈکس ہو جو قرآن کریم کی ساری تعلیم کو مختلف عنوانات کے تحت اس طرح پیش کرے کہ ہم جس موضوع کے متعلق چاہیں وہ بیک نظر بتمام وکمال ہمارے سامنے آجائے۔ یہ تجاویز قرآنی تعلیم کو سمجھنے کے سلسلہ میں احباب کے شوقِ بے پایاں کی آئینہ دار تو ہیں لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کی کتاب ایک انسائیکلوپیڈیا ہو گی جس کی تالیف بحالاتِ موجودہ میرے لئے ممکن نہیں۔ لغات القرآن اور مفہوم القرآن الگ الگ موجود ہیں۔ جہاں تک انڈکس کا تعلق ہے، میں کئی برسوں سے تبویب القرآن کی ترتیب و تالیف میں مصروف ہوں۔ اس کا کافی حصہ مرتب ہو چکا ہے لیکن ابھی بہت سا باقی ہے۔ باقی رہی تفسیر۔ سو احباب چاہتے ہیں کہ میں جس انداز سے ہفتہ واری درس دیتا ہوں، اسی انداز کی تفسیر مرتب ہو جائے۔ میرے لئے تو ایسا کرنا مشکل ہے۔ البتہ قرآن کریم کے ایک والہانہ شیدائی (عزیز محترم ملک ظہور احمد۔ راولپنڈی) کئی برسوں سے میرے درس کے (TAPES) کو صفحاتِ قرطاس پر منتقل کرنے میں منہمک ہیں لیکن یہ مہم خاروشگافی سے جوئے شیر لانے کے مرادف ہے۔ دعا ہے کہ خدا انہیں اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی ہمت عطا فرمائے۔ اگر یہ سلسلہ درازِ مکمل ہو کر شائع ہو گیا تو یہ ہو گی وہ تفسیر جس کا تقاضا احباب کیطرف سے موصول ہوا ہے لیکن میں اس کا وعدہ نہیں کر سکتا کیونکہ بات میرے بس کی نہیں۔

(۳) تصریحات بالا کی روشنی میں فیصلہ یہی کیا گیا ہے کہ مفہوم القرآن کو سردست موجودہ انداز ہی میں رہنے دیا جائے۔ البتہ جب جدید ایڈیشن شائع کیا جائے تو اس میں موجودہ ایڈیشن کی غلطیوں کی تصحیح کر دی جائے۔

(۴) میں احباب کے مخلصانہ مشوروں کا بدل شکرگزار ہوں۔

(پرویز)

خوشخبری

مفہوم القرآن کی طباعت و اشاعت کا انتظام میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ کے سپرد تھا۔ انہوں نے اپریل ۱۹۶۷ء میں ستائیسواں پارہ چھاپا اور اس کے بعد اس کا سلسلہ رک گیا۔ پرویز صاحب کی قرآنی فکر کے شیدائیان کے لئے یہ انقطاع جس قدر باعثِ سوہانِ روح تھا اس کا اندازہ ان کی طرف سے موصول ہونے والی شکایات سے بخوبی ہوتا تھا۔ لیکن ہم اس باب میں مجبور تھے۔

للہ الحمد کہ اب مفہوم القرآن کی طباعت و اشاعت کا انتظام ادارہ طلوع اسلام کے سپرد ہو گیا ہے۔ چنانچہ ہم نے سب سے پہلے اٹھائیسویں پارہ کی کتابت شروع کرادی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ تین چار ماہ میں یہ آخری تینوں پارے (۲۸-۲۹-۳۰) شائع ہو جائیں گے۔ جو حضرات ان پاروں کے انتظار میں تھے وہ اپنے آرڈرز فوراً بک کرا لیں تاکہ جس وقت یہ پارے چھپیں انہیں بھیجے جا سکیں۔ اگرچہ اب سامانِ طباعت کی گرانی کی وجہ سے لاگت بہت بڑھ جائے گی لیکن ہم سر دست قیمت میں اضافہ کرنا نہیں چاہتے۔ ان تینوں پاروں کی قیمت ۲ روپے ہی لی جائے گی۔ محصول ڈاک پچیس پیسے ہوگا اور اگر آپ بذریعہ رجسٹری منگانا چاہیں تو سوا روپیہ ہوگا۔

۲۔ اس وقت ہمارے پاس پہلے ۲۷ پارے سٹاک میں موجود ہیں۔ علاوہ ازیں پہلے بیس پارے دو جلدوں میں (یعنی دس دس پارہ کی جلد) بہت تھوڑی تعداد میں موجود ہیں۔ یہ پارے یا جلدیں فرمائش موصول ہونے پر فوراً بھیجی جا سکتی ہیں۔ ان کی قیمت اور محصول ڈاک حسبِ ذیل ہوگی۔

(۱) پہلا پارہ۔ سستا ایڈیشن۔ ایک روپیہ۔ اعلیٰ ایڈیشن۔ تین روپے

(۲) پارہ ۲ تا ۲۷۔ دو روپے فی پارہ۔ محصول ڈاک ۲۵ پیسے فی پارہ۔ خرچہ رجسٹری ۵۰ پیسے (واضح رہے کہ خرچہ رجسٹری ایک پارہ پر بھی وہی لگے گا اور ایک سے زیادہ پاروں پر بھی وہی۔ یعنی ۵۰ پیسے)

(۳) موجودہ دس دس پاروں کی جلدوں کی قیمت۔ جلد اول۔ اکیس روپے، جلد دوم بیس روپے۔ محصول ڈاک فی جلد دو روپے۔

(۴) یہ اعلان اس وقت تک کے لئے ہے جب تک آخری تین پارے (۲۸-۲۹-۳۰) شائع نہیں ہو جاتے۔ اس کے بعد پاروں کی قیمت اور سپلائی کے متعلق نیا اعلان کیا جائے گا۔

(ناظم۔ ادارہ طلوع اسلام)

بقیہ "علمائے کرام"۔ از صفحہ ۷۸ مسلسل

سب سے زیادہ متبع ہو۔ آپ نے یہ اس وقت فرمایا تھا جب کسی نے آپ کے کسی کام پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ یہ فلاں شخص کے عمل کے خلاف ہے تو آپ نے فرمایا کہ اگر تم حضور صلعم کے زمانے کے موافق عمل کرتے ہو تو پھر اس بات کی پرواہ نہ کرو کہ اس طرز عمل سے اپنے زمانے کے بعض لوگوں کی مخالفت لازم آتی ہے کیونکہ لوگوں نے تو قیاس کو اپنے اوپر مسلط کر لیا ہے اور ان کا نفس اس بات کا اقرار کرنا گوارا نہیں کرتا کہ ان کا یہی قیاس انہیں جنت سے محروم کرنے کا سبب بنے گا۔ بلکہ انہوں نے الٹا اس امر کا دعویٰ کیا کہ جنت کا حصول قیاس کے علم کے بغیر ممکن نہیں۔

(باقی آئندہ)